گنجہائے گراں مایہ

از

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ملنے کا پتہ: سلطان بک ڈپو کالی کمان حیدرآباد دکن

قیمت

منظور شدہ پنجاب یونیورسٹی

گنجہائے گرانمایہ

مصنفہ
پروفیسر رشید احمد صدیقی
صدر شعبہ اردو
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فرنیڈز پبلشرز
راولپنڈی
۱۹۵۱ء

ملنے کا پتہ۔ سلطان بک ڈپو کالی کمان حیدرآباد دکن

بار دوم

سنہ ۱۹۵۱ء

فہرست

مولانا محمد علی

ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی!
عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے۔ لیکن محمد علی نے خود موت کا
انتخاب کیا! اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں
کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا ــــ سنگین اور صالح!
محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتاد
طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ
ہے ــــ صحیح اور گرانمایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کس کی زندگی میں نہیں
ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پر شوکت بنا دیا
محمد علی کو بد توفیقوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا، ایسے بد توفیق

اور بد مذاق جو بھوکے تھے لوا لہواس اور کینہ پرور بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام لیا۔ لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

محمدؐ علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں۔ کتنے چشمے اُبل رہے ہیں۔ کتنے عزائم بیدار اور کتنی روحیں دار و رسن کے طلب گار ہیں! یہ کس کا فیضان ہے۔ محمدؐ علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا بلکہ وہ آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں! مردِ غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت۔ مالِ غنیمت کی فراوانی جشن و جلوس کی ہمہمی و طرب انگیزی، برگستوں کی زینت، تمغا اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح، اور دمکتے ہوئے چہرہ ——— ڈوبتے ہوئے سورج سے!

محمدؐ علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح تابندہ و تپاں ——— بشارت ازلی بھی حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف

تھے کیسی مخالفت! اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد نفس پروری اور
تن آسانی کے لئے۔ وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں
لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو۔ بشارت ازلی اسلئے کہ شخصیت کامیاب
رہی شخص کا انجام ناقابل التفات۔ توفیق انسانی اور تقدیر الٰہی اکثر
برگزیدہ افراد کی ناکامی میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اسے ناکامی نہیں
کامرانی بتایا گیا ہے۔

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اصیل تھی
جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔
وہ مخالفت اور مقابلہ میں بے باک اور بے پناہ تھے۔ وہ چھوٹوں
پر شفقت کرتے تھے۔ اُن کو پناہ دیتے تھے، ان کی دل وہی اور دل آسائی
کرتے ان کے لئے مارنے مرنے پر تیار رہتے، محمد علی کی آغوش میں رحمت
تھی۔ ان کی مدد لینے کی معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری، ساری
فلاکت و ہلاکت محمد علی کی اور کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی!
وہ آغوشِ مادر، بازوئے برادر اور راحتِ عزیزاں تھے۔

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا ابو الہول

کی آواز اہرامِ مصری سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے! میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے ع :-

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے!

اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک تڑپ غزیو اور غلبہ سے بولتے وہ میں نے دیکھا ہے۔ وہ بولنے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے۔ وہ دنیا کے ہر حربہ کا جواب اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔

محمدؒ علی پر دولت و شہرت کی بارش ہوئی۔ محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب بنا کر بہا دیا۔ دونوں نے مفارقت کی۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا۔ لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی — ظاہر کیا معلوم زندہ رہتے تو کیا ہوتا۔ بوریائے بوذرؓ اور سریر سلیماں کو یکساں سمجھنے والے کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے۔

محمدؒ علی کی موت کا حال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کیلئے یقین

نہیں آیا، رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ محمدؐ علی کو آخر موت نے زیر کس طور
پر کیا۔ خود موت پر کیا گزری ہو گی،

پھر سوچنے لگا کہ اگر محمدؐ علی کی بجائے قضا و قدر یہ چارۂ کار پیش
کرتے کہ اچھا محمدؐ علی کی بجائے ہندوستان کے کسی اور مسلمان لیڈر کو حوالہ
کر دیں۔ سوال آتے ہی خدا جانے یہ فیصلہ دل میں کیسے آیا اور انتہائی قطعیت
کے ساتھ کہ محمدؐ علی کے بدلہ میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جا سکتا
تھا اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا! لوگ آزردہ نہ ہوں، انسان کے دل میں
عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں۔ انہی خیالات کو کبھی الہام
قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ مہمل بھی ہوتے ہیں لیکن خیال کے عجیب تر
ہونے کے معنی ہمیشہ مہمل ہونے کے تو نہیں ہیں۔ محمدؐ علی میں کمزوریاں
بھی تھیں لیکن ان کی کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں
جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ملک و ملّت کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ لیکن نعرۂ جنگ
خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست
ہوتی رہے۔ لیکن جنگ آزما کہاں ہے، شہادت کس کو نصیب ہوگی
ایسا حسینؓ کہاں جس کی خونریزی یزید کو تلاش ہو۔

آئیے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا۔ وہاں
آج محمدؐ علی کی معراج منائیں!

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر
اللہ اکبر و للہ الحمد

ڈاکٹر انصاری مرحوم

بر خاکِ شہیدے برگہاے لالہ می پاشم

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تو یہ سوال فوراً زبان پر آتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جبکہ ڈاکٹر انصاری کی رحلت کی خبر آئی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطل رہے سوچنے لگا۔ آخر ڈاکٹر انصاری کیوں کر جاں بحق ہوئے اور یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لئے اس موت کا سدباب نہ کر سکے جس کو ان کی نتھری چمکیلی گہری اور مریض اور تندرست دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں ٹال دیتی تھیں۔ اور بھگا دیتی تھیں۔

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف میں رجوع کرتا رہا میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی غم ناک اور غلیظ ہو جاتی جبکہ میں اس طرح

چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو اس وقت میں اُن کے مطب کا رُخ
کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کرہ
میں بیٹھا فتحپوری کی دکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو۔ گاڑیوں اور
پھیری والوں کے شور وشغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر یہ
مشغولیت، یہ غلفشار زندگی ہے جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا
جاؤنگا زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر پھر اس
مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہوجاتا اور میں زیادہ بے تابی
کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہوجاتا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی وہ اپنے مضبوط اور ہموار قدموں
سے زینہ پر چڑھتے اور کسی ہمراہی سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے
دیکھتے ہی مسکراتے اس طور پر کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی
مسکرانے لگتیں، کہتے بھئی تم کہاں، بڑے عرصہ تک غائب رہے ہیں کہتا
ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے، پریشان ہوں کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا
بولتے گھبراؤ نہیں ابھی دیکھتا ہوں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔
یہ باتیں اس لب و لہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد اور اعتقاد دل
آسائی اور دل ربائی کے ساتھ دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ مجھے خود
محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا۔ اس سے پہلے کیوں نہ آیا خواہ مخواہ

اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا اس سے بات کرتے جاتے انداز گفتگو سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لئے کر رہے ہیں کہ مجھے تقویت پہنچے اور مجھ سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ وہ دوسروں میں بھی اعتماد اور امید کی روح پیدا کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ صرف مریض یا اُن کے اعزا نہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے مقاصد کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ جادو تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ گو ڈاکٹر انصاری مخاطب دوسروں سے ہیں لیکن کہہ وہی رہے ہیں جو ہماری تقویت یا دلچسپی کا موجب ہو۔

ڈاکٹر انصاری اپنے معائنہ کے کمرہ میں لے جاتے، مجھے اس قسم کے معائنہ خانوں اور اپریشن روم وغیرہ میں جانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے لیکن جس امید اور اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر بھاٹیا (لکھنؤ) کے حوالہ کیا ہے وہ مجھے کہیں اور نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اس طرح دیکھتے ٹٹولتے گویا وہ خود اپنے زخم یا درد کو ٹٹول رہے ہیں۔ اُنکی انگلیاں خوبصورت سڈول، گداز، پاکیزہ، خوش رنگ اور ایسی معتدل حرارت کی ہوتیں اور اُن کو وہ اس نرمی اور نزاکت کے ساتھ کام میں لاتے کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گھنی ابرو ئیں

اور لمبی پلکوں والی گہری روشن اور ہنستی ہوئی آنکھیں اور شیر و شہد سی نگاہیں جو جسم و جان میں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی اچھا خیال یا اچھا کام قلب کو بالیدہ، جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہے۔ وہ مریض کا معاینہ اس طرح کرتے جیسے وہ ان کا جان چھڑکنے والا بھائی، بھتیجا بیٹا یا جاں نثار دوست ہے۔ اُن کی پیشانی ایک روشن فضا تھی جس میں مریض کو مید اور برآنے والی امید کے نقوش نظر آتے تھے۔

معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کوئی اور کام کرنا نہیں ہے اور اسی مریض پر تمام وقت اور توجہ صرف کر دینگے معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریض کو خود سہارا دے کر اٹھاتے کچھ دیر تک اسے میز پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھا رہنے دیتے اور خود اُس کے پاس کھڑے ہو کر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گہرے بے تکلف دوست سے خوش گپی کر رہے ہوں۔ اس کے بعد سہارا دے کر میز سے اتارتے، کپڑے پہنانے میں مدد دیتے، نسخہ لکھتے استعمال کی ترکیب بتاتے اور رخصت کر دیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہیگی۔ چنانچہ میں مطب سے اترتے ہی فتحپوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل اور ہما ہمی میں گم ہو جاتا۔ پھل والوں کے ہاں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل

میں جاکر کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو بدپرہیزی سے ازسرِنو حاصل کرتا۔ دل کا اندوہ چھٹ جاتا اور زندگی خوش گوارا اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی۔

میں نے ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سرجری کرتے بھی دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ماہر مصور کے ہاتھ میں موقلم ہے یا کوئی مرصع ساز کسی نازک زیور یا مشین پر کام کر رہا ہے۔ نشتر اُن کی انگلیوں میں اس طور پر کام کرتا جیسے بہزاد اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے۔ نزاکت اور صلابت دونوں کا امتزاج، ایسا امتزاج جو قوس قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے چہرہ پر سنجیدگی آنکھوں میں گہرائی۔ انگلیوں میں صفائی اور تیزی۔ آپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری کو آپریشن کرتے دیکھئے تو معلوم ہوتا جیسے مشین کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو اسکریو سے جڑے ہوں، خوبی پھرتی اور اعتماد کے ساتھ علیحدہ کر رہا ہے۔

مدتیں گزریں میری طفولیت اور الہلال کے شباب کا زمانہ تھا۔ الہلال کے جتنے پرچے آتے تھے ہم لوگ اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہ سمجھتے وہاں یہ خیال کرتے کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اسلیئے اس کا اور زیادہ احترام

کرتے پچھلی بار گھر گیا۔ بچپن کے زمانہ کی الماری گرد و غبار سے اٹی پڑی تھی ایک کاغذ پر اتفاقیہ نظر جا پڑی۔ دیکھا تو اس وفد کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سرکردگی میں جنگ بلقان میں زخموں کی مرہم پٹی کے لئے ہندوستان سے گیا تھا۔ یہ تصویر اس زمانہ میں الہلال میں شائع ہوئی تھی نیچے لکھا ہوا تھا

لے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو جب وہاں پہنچنا
تو خدارا اُن کے زخموں پر سختی نہ کرنا کیوں کہ وہ زخم ان کے نہیں
ہیں بلکہ اسلام کے ہیں۔"

وہ زمانہ یاد آگیا جب ابوالکلام محمد علی ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گزرے ہیں۔ بڑے ہوکر ہم بھی ہندوستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے فاتح کہلائیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں ہے۔ آج جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں ماضی کا غبار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور تصور کی کرنیں طفولیت کے اس افق پر پڑ رہی ہیں جہاں ہم رہ رہ کر تلملا اٹھتے تھے کہ کیوں بچپن کا زمانہ نہیں ختم ہوتا اور ہم ترکوں کی مدد کے لئے اسلام کا نام روشن کرنے کیلئے زخمی ہونے کے لئے سپاہیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لئے کیوں نہیں بلائے جاتے۔ لیکن اب کیا حال ہے؟ ہم بدل گئے زمانہ بدل

گیا دنیا بدل گئی رنج و راحت، عزت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جد وجہد وہی ہے لیکن جد وجہد کا لطف باقی نہیں رہا، تصورات میں نہ رنگینی باقی رہی نہ حرارت، عزائم میں نہ استواری ہے اور نہ برکت، مانا کہ موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات کچھ اور ہی ہیں فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدارا کوئی یہ بتائے یہ کیسے مسائل ہیں یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی۔ دلوں میں ولولے نہیں پیدا ہوتے ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے پرانے وقت کا ہوں۔ راگنی بے وقت کی ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ زندگی اور زندگی کے تار پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ رہی ہے جس چیز کو ہم متاعِ یوسفی سمجھتے تھے وہ متاعِ کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہی حاصلِ حیات ہے زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی برہنگی کو برگزیدہ حقائق کا انکشاف کیوں کر مانا جائے سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے۔ آرٹ اور آزادی کی قربان گاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ افراد کی شادی اور غمی کیا ہوگی ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی جماعت کے ریگ زار سے افراد کی امید اور امنگ کے نخلستان کیوں فنا کئے جا رہے

رہیں، زمانہ کے بدلنے سے زندگی کی سیئات حسنات میں کیوں کر تبدیل ہو جاتے ہیں

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلمانوں کے نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں تمام عمر کوشاں رہے۔ وہ نفاق و افتراق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مرض سمجھتے تھے۔ اور ایک سچے طبیب اور ڈاکٹر کی مانند مریض سے ہمدردی کرنے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دل سوزی اور قابلیت صرف کرتے رہے انھوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہندو یا مسلم کی حیثیت سے نہ کبھی پرکھا اور نہ اس کی چارہ سازی کی، انھوں نے اس مرض کے ازالہ کی ایک حقیقی طبیب کی حیثیت سے کوشش کی ڈاکٹر انصاری کے لئے اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی نہ تھا۔ وہ جب کرتے جیسا کچھ کرتے اور جتنا کر سکتے سب طبیب ہی کی حیثیت سے کرتے اور ایسا ہی انھوں نے کیا۔

ڈاکٹر انصاری کی وفات سے کتنے لڑکے لڑکیاں یتیم ہو گئیں، بیوائیں لاوارث ہو گئیں۔ نوجوان بے دست و پا ہو گئے۔ رفقا جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ معلوم نہیں کن کن مواقع پر کیسے کیسے لوگوں کی مدد کر چکے تھے۔ اس بڑے پہیئے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق مشینیں گردش کر رہی تھیں وہ محتاجوں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ اُن لوگوں کی آن بان اور وضع داری

کے بھی کفیل تھے جن کو "آسیائے گردش ایام" برابر پیستی جاتی تھی۔ ایسوں کی دستگیری معمولی کام نہ تھا۔ دولت، اثر، اقتدار کا کتنا بڑا حصہ ان پر صرف ہوتا ہوگا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے ہر قسم کی مدد انتہائے کشادہ جبینی اور دریا دلی کے ساتھ دوسروں کی کی ہوگی۔ اور شاید کوئی ایسا نہ ہو جس سے اسی نوعیت کی مدد ڈاکٹر انصاری نے حاصل کی ہو۔

انھوں نے خوب کمایا، خوب صرف کیا، ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آئے جب اُن کے پاس کھانے اور خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں کسی ایسے کو جس کے کفیل ڈاکٹر انصاری تھے۔ کبھی کسی ایسے موقع سے دو چار نہیں ہونا پڑا جب اس کو کھانے اور خرچ کرنے کی سختی جھیلنی پڑی ہو ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے ڈاکٹر انصاری کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر ڈاکٹر کے احسانات تھے ڈاکٹر کے لئے کیا کرتے ہیں۔ ڈر صرف اسی سے ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اکثر و بیشتر صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لینے میں تو حق و ناحق کی بھی تمیز اُٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اُس حالت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے قیام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے اُن کی جو اہمیت ہے اور وہ لوگ جو اس سے وابستہ تھے اس کا اندازہ میں کرسکتا ہوں۔ غالباً چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو مجھ سے زیادہ اس کا احساس کرسکتے ہیں۔ ابھی ابھی رمضان کی ایک شام کو ذاکر صاحب[1] کے ہمراہ جامعہ کی نئی عمارت دیکھنے اور کھلے جانے کا اتفاق ہوا۔ او کھلے کے صاف اور سادے ورق پر ایک نقش اُبھر رہا تھا، بدیع اور بلند عمارت کے نقشہ پر دیوار و در کہیں کہیں سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ تصوّر تصویر میں منتقل ہو رہا تھا، مستقبل کا افق دھیرے دھیرے ان تمام گہرائیوں اور پہنائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو رہا تھا جن میں مومن کا عزم پرورش پاتا ہے۔ بالیدہ ہوتا ہے اور آفاق پر چھا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودۂ خاک تھے اور مدفن کے بہشتی جھروکے سے اپنے حسنات کی فردوس تعمیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

—— دیر ہو رہی تھی ہم سب واپس آگئے!

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ دہلی۔

مولینا سلیمان اشرف صاحب

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مولینا سلیمان اشرف صاحب اس جہاں سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے جو میرے لئے اب کسی اور میں نہیں۔ میرا اُن کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا لیکن کس سے کہوں اور کون سمجھے گا اس رشتہ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لئے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے، بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست۔ پریشان ہوتا تو ان کے ہاں جاتا جی گھبراتا تو وہاں جاتا خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا ——— اور جب کہیں نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا، گھنٹوں بیٹھتا کوئی معمولی جان پہچان یا تعلقات کا آدمی پہلے سے موجود ہوتا تو اسے رخصت کر دیتے کوئی اچھا ملنے جلنے والا موجود ہوتا تو اسے اٹھنے نہ دیتے۔ جو کچھ

موجود ہوتا اس سے ضرور تواضع کرتے۔ ایسا کبھی نہ ہوا کوئی چیز موجود نہ ہو
مجھے چائے کا شوق نہیں، مرحوم اس کے بڑے شائق تھے اور بڑے تکلف سے
پیتے۔ اصرار سے ایک پیالی دیتے کہتے پی لو۔ پھر گپ ہوگی۔ ایک پان کھاؤ
دوسرا مجھے بنا کر دو۔

میں کہتا آپ کے ہاں چائے میں نہ شکر نہ دودھ، فرو کیسی ہوگی؛
کہتے میرے لئے پیتے ہو یا اپنے لیے؟ میں نے دبی زبان سے کہا بیوی بچوں کا
بھی تو خیال ہے۔ فرمایا کبھی کبھی بیوی بچوں سے الگ رہ کر بھی زندہ رہ
لیا کرو۔ میں کہتا آپ رام پوری تمباکو کھاتے ہیں۔ یہ میرے بس کی نہیں۔
کہتے چائے میں دودھ شکر اور پان میں خوشبو دار تمباکو کھاتے ہو، نشہ کا
احترام کرنا نہ آیا۔ آواز دیتے جُمّا! رشید کی پیالی میں شکر ڈالنا پھر پکارتے
"گچھن" رشید کو تمباکو دو۔ بڑی مزے دار معطر تمباکو ہوتی۔

پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ آج تک یہ نہ پوچھا کیسے ہو بال بچے
کیسے ہیں۔ کیا کرتے ہو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو میں خود
ہی کہتا یا انھیں پہلے سے معلوم ہوتی۔ کبھی انھوں نے مجھے گھر سے بلوا نہ
بھیجا کیسی ہی ضروری بات کیوں نہ ہوتی اس کے منتظر رہتے کہ چلتے پھرتے
ملاقات ہو جائے گی تو کہہ دیں گے۔ ایسا موقع ہوتا تو صرف چند منٹوں
میں بات ختم کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے "اچھا جاؤ"۔

مجھے خوب یاد ہے ایک دن میں "دو منزلے" کے سامنے سے بڑی تیزی سے سائیکل سے گذر رہا تھا سامنے چبوترے پر ٹہل رہے تھے فوراً پکارا ذرا ٹھہرنا میں رُکا۔ سائیکل کو چبوترے سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا۔ فرمایا نہیں نیچے ہی کھڑے رہو۔ ایک بات کہنی تھی، وہ تمھارا یار اصغر (اصغر حسین اصغر مرحوم) اب کے الہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا کیا شعر کہا ہے:۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص مترنم کسی قدر حزیں لیکن پُر وقار لہجہ میں پھر پڑھا کہنے لگے، رشید اس شعر کا کہنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ الہ آباد تک ساتھ رہا خوب کڑھا ہوا آدمی ہے۔ اب کبھی آئیں تو ضرور لانا۔ اس شعر کی خوبی کی تفصیل پھر کبھی سناؤں گا، اس وقت جاؤ، خوش رہو!

مرحوم کے ہاں کوئی خاص موضوع گفتگو کے لیے مخصوص نہ ہوتا، باتوں ہی باتوں میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی، ہر بات بے ضغطہ زبان کہتے "بے ضغطہ زبان" انہی کا فقرہ ہے۔ کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثقاہت کی زبان پر نہیں آتے لیکن اس بے ساختگی سے اور اتنا برجستہ کہتے کہ اُس لفظ کی بدنمائی کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی باتوں میں حلاوت بھی کبھی کبھی بہار کا کوئی لفظ بول جاتے اور کہہ

دیتے کہ یہ خاص ہمارے دیار کا لفظ ہے ایسا جامع لفظ کہیں اور نہ ملے گا
کرسی ہو مونڈھا ہو صوفا ہو تخت ہو بیٹھتے ایک ہی وضع سے تھے۔
پاؤں اٹھا کر اور سمیٹ کر۔ اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے مطالعہ کرتے لکھتے اور
باتیں کرتے نشست کا ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چبوترے سے متصل نیم دائرہ
سائبان میں مونڈھے بچھے ہوتے۔ ایک طرف چارپائی بھی ہوتی بڑے سے
بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا اس کیلئے کوئی اچھی کرسی یا صوفا وغیرہ اندر سے
نہ نکالا جاتا۔ جو موجود ہوتا اسی پر وہ بھی بیٹھ جاتا اور سارے مجمع کو دیکھ کر
یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ کسی سے آج تک مرحوم
نے ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ مولینا نو وارد سے مرعوب ہیں یا
اس سے خاص طور پر مخاطب ہیں۔ بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے مرحوم
کے پاس بیٹھے دیکھا ہے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن مولینا ہر ایک سے ایک
ہی اتار چڑھاؤ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولینا کا پرانا نوکر جمّا اسی طرح نواب
صاحب کو چائے کی ایک پیالی لا کر دے گا جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو
دیتا، وہی بے ضغط زبان گفتگو وہی نشست، وہی فضا جس کا جی چاہا
اٹھ کر چلا گیا۔ اسی دوران میں معزز نو وارد بھی تشریف لے گئے، اور مولینا
مرحوم اپنی جگہ پر جوں کے توں باغ و بہار یا کوہِ وقار بنے بیٹھے رہے۔
زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اکثر محسوس

یہی محسوس ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو
اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ
اس میں تھوڑا بہت گوارپن بھی ہے کوئی بڑا عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت تنگ
نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی اللہ والے ملے تو بعض دنیا
کے کام کا نہ پایا کسی منکر خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت و عظمت
کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع
اور ہر موقع سے اس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ ان کی صحبت میں جی لگتا اور یہ
کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں جگہ کمی ہے جسے پورا کرنے کیلئے کسی اور کو ڈھونڈھنا چاہیے

میرا اُن کا بیس بائیس سال سے ساتھ تھا پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں
نو وارد کس مپرس طالب علم تھا جب ان کا ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا۔
دوسروں کے نزدیک نہ سہی اپنے نزدیک سہی میں نے بھی اس مدت میں بہت
کچھ دیکھا سنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ کچھ اعتماد بھی
رکھتا ہوں لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے جو سلوک
مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا، انھوں نے اپنی خدا داد ذہانت
واخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور
اپنی آرزو کے عین مطابق پایا مولانا کی صحبت سے جب کبھی اُٹھتا تو معلوم
ہوتا کہ میں نے کوئی نئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھا جذبہ

پیدا ہو گیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھا رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہو گیا۔ خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔

آج کم و بیش دس گیارہ سال ہوئے۔ یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولینا خاص طور پر زد میں تھے۔ ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں ڈگمگانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ عالم گزر چکا ہے۔ اس زمانہ میں میں نے مولنا کو دیکھا کیا مجال کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آجاتا جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔ شام کے وقت برآمدہ میں لوگ بیٹھے ہوتے چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام نشان نہیں۔ کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرتا۔ ایک دن شب میں میں بھی حاضر ہوا میں مرحوم کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے تھے، میں نے کہا مولینا کیا ہونے والا ہے خدانخواستہ نوع دیگر ہوا تو کیا ہوگا کہنے لگے رشید! تم بھی ایسا کہتے ہو۔ مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ چھیڑو گے ہوگا کیا وہی ہوگا جو ازل سے تقدیر ہو چکا ہے۔

مومن کی شان یہی ہے کہ اُس پر ہراس طاری نہ ہو، تم ڈرو گے تو ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ ہو چکا ہے۔ پھر ڈرنے جھجکنے سے کیا فائدہ؟

مولنا پر اس وقت ایک عجیب جلال سا طاری تھا اور مجھے شہنشاہیت روما کا وہ عہد یاد آگیا جب گالس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشہ میں آکر سینٹ کا رُخ کیا جہاں کا ہر رکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست ہی پر ذبح کر دیا لیکن کسی سینیٹر نے نہ اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ وزاری کی۔

وہ دن گزر گئے جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا، مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت میں اُس زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں، تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا، اس وقت صرف مولینا کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اوران کے تاریخی دو منزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوتے تو بھی مولینا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا!

سنہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے نان کو آپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے

متنفس تھا۔ اتنے میں دور سے ایک بوڑھا لیتہ قد منحنی شخص جھکا ہوا انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ خوف عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا، مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا۔ یہ مولینا ہدایت اللہ خانصاحب جبروت جونپوری مرحوم کے استاد اور جونپور میں اس وقت علم و فضل کے چشم و چراغ تھے۔

مرحوم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و طنطنہ تھا ان کی شفقت میں بھی جبروت کار فرما تھا میں نے مرحوم کو جھجک کر یا گول ہول باتیں کرتے کبھی نہ پایا ایک بار میں مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا۔ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے آدمی نے مولینا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا مولینا براہِ نوازش آج شب کا کھانا غریب خانہ پر تناول فرمایئے۔ مولینا نے بغیر کسی تامل کے بے لاگ کہا نہیں جناب میرا آپ کا کھانے کا کھاتا نہیں ہے یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ صاحب بڑے خفیف ہوئے لیکن مرحوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا ہم سب سخت متحیر ہوئے۔ آخر میں مرحوم نے فرمایا جی ہاں میرا اُن کا کوئی کھاتا نہیں ہے۔ اس قسم کے کتنے اور واقعات ہیں کئی سال کی بات ہے مرحوم اجمیر شریف جا رہے تھے، اتفاق وقت جس گاڑی سے مرحوم سفر کرنیوالے تھے اُسی سے ایک بڑے ذی وجاہت بزرگ کا یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم تھا۔ اُن سے مولینا آزردہ تھے انھوں نے شاید یہ سمجھا کہ مولانا بھی ان کی پذیرائی کے لیئے تشریف لائے ہیں۔ دل میں

خوش ہو کر آگے بڑھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مولینا نے بغیر کسی پس و پیش کے فرمایا "جی اس سعادت کے لئے دوسرے آئے ہوئے ہیں میں ہاتھ نہیں ملاتا" یہ کہہ کر اپنے ڈبہ میں سوار ہو گئے۔

آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد پر یونیورسٹی کے کسی جلسہ میں شریک نہ ہوئے کسی بڑے آدمی کے گھر نہ جاتے تاوقتیکہ اس سے یارانہ نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہے مرحوم کی ایسوں ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو دین و مذہب سے دور کا بھی سروکار نہیں اور ایسوں سے بھی تھی جو اپنے وقت کے بڑے جید عالم دین سمجھے جاتے تھے، ہر شخص محبت و احترام کے جذبات لے کر آتا تھا اور مطمئن و مسرور واپس جاتا۔ جس سے طبیعت نہ ملتی تھی کبھی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھ سکے مرحوم اس معاملہ میں بڑے کھرے تھے کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی تالیف قلب کی لیکن جن سے خاص تعلقات تھے اُن پر جان چھڑکتے تھے اسکی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اسکی خوشی سے باغ باغ ہو جاتے۔

مولینا کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعقول مضامین نکلے اور اکثر ایسے ناروا اور رکیک حملے کئے گئے کہ انھیں یاد کر کے آج تک میرا دل کڑھتا ہے اور لکھنے والوں سے مجھے قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے لیکن مولینا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ مولینا پر اس کا کوئی اثر ہے۔ ایک دن معلوم نہیں کون سا موقع تھا اس

اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو مرحوم نے فرمایا اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے
چلو آگے بڑھو۔ یہ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے۔ صاحب زادہ ہو یہی دیکھتے ہو کس
کے خلاف کہہ رہا ہے لڑائی مجھے پسند ہے لیکن بہادروں سے بیسواؤں سے نہیں"
مرحوم کی شخصیت کا ایک عجیب کمال تھا جس کو میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن
وضاحت نہیں کرسکتا ممکن ہے مثال دینے سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جائے
مرحوم کے دن رات کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں فرداً فرداً کوئی خاص جاذبیت
نہ تھی لیکن یہی لوگ جب مرحوم کے حلقہ میں بیٹھے ہوتے تو یہ مجموعہ نہایت
دلکش معلوم ہوتا تھا۔ اور ہر شخص فرداً فرداً نہایت دل پذیر۔ اور یہ بات
کچھ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مرحوم کے کمروں کے اندر جو چیز جہاں
رکھی ہوتی اس میں بھی ایک خاص کشش نظر آتی۔

کم و بیش بیس سال سے مرحوم کے کمروں کے اندر کی تقریباً تمام چیزیں میری
نظروں میں ہیں جو چیز جہاں آج سے بیس سال پہلے دیکھی تھی وہ آج تک
موجود تھی کرسیوں کی وہی ترتیب کتابوں کی الماری اسی جگہ پر تخت کی وہی
جگہ وہی پوشش کھونٹیوں کا وہی مقام پاندان اسی کرسی پر چھوٹے چھوٹے
بکس اور ٹوکریاں تخت کے پائیں۔ آتش دان پر گھڑی بوتل چائے کا ڈبہ
دو چار پیالیاں کھلی ہوئی شلف پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کا انبار
تخت کے اوپر کھونٹیوں پر لٹکی ہوئی قیمتی کپڑوں کی شیروانیاں اور خوش رنگ

صاف ایسا معلوم ہوتا جیسے مرحوم کی شخصیت کے یہ سب عناصر ترکیبی ہیں اب ادھر سے گزر ہوتا ہے تو دومنزلہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی اور دل بھر آتا ہے ۔

میرا پہلا مکان دومنزلہ سے بہت قریب تھا، مردانے کے بیرونی دروازہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب درختوں کی جھلملی میں دومنزلہ کا قوسی برآمدہ اور چبوترہ نظر آتا تھا، گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا اور طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی کبھی کبھی دروازہ سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے چبوترہ پر لمبی کشادہ آستینوں کا ململ کا سپید کُرتہ پہنے سر پر قیمتی مخمل کی گول ٹوپی پاؤں میں دلّی کی نازک پُرزر جوتی پہنے، سر نیچے کئے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرتے نظر آتے دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گنگنا رہے ہوں گے، اگر چلا جاؤں تو وہ اس طور سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو جائے گی ۔ بس اتنا ہی احساس میری تسکین قلب کے لئے کافی ہوتا ۔ میں مکان کے اندر آجاتا اور دعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولٰنا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر ان کی شفقت، مرحمت اور لطافت و ظرافت سے سیر کروں ۔

مرحوم کو بیحد سر ڈاکٹر اقبال سے بڑا اُنس تھا ۔ حالانکہ ان کا

تمام عمر خود اپنے کسی بچے سے سابقہ نہیں ہوا تھا وہ صرف چند مہینوں کا تھا کہ اسے بلا بھیجے۔ گود میں بٹھاتے اس کا نام کدو رکھا تھا، پیشاب کر دیتا تو کہتے ابے کدو تو نماز نہ پڑھنے دے گا' اچھا کوئی ہرج نہیں کہ پیشاب بڑا ہوگا تو کہے گا مولیٹا ابا پر پیشاب کر چکا ہے۔ جب وہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اپنی دونوں ہاتھ کی انگلی اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور کہتے ناچ بے کدو ناچ اس کے بعد اپنے مخصوص دل نشین لیکن پُر وقار لحن میں کہتے، "تومُ تومُ رے باجے تومڑی تومَ تومَ رے باجے تومڑی" ہاں ناچ بے کدو ناچ"

سال ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک دن شام کو اقبال کو لیکر بھیکم پور چلے گئے بغیر ہم سب کو اطلاع کئے۔ دوسرے دن واپس آئے بے حد خوش معلوم ہوا کہ بچے نے بالکل تنگ نہیں کیا، لیکن مرحوم تمام رات اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ انھوں نے بالکل اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ یکایک بغیر کہے سُنے کیوں اقبال کو بھیکم پور لے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک بار دو دن کے لئے بغیر کہے سنے اقبال کو ہاتھ میں لے کر چلے گئے۔ ایک دن اسی زمانہ میں بچہ کو دیکھ کر کہنے لگے کدو تیرا باپ تجھے کپڑے نہیں پہناتا اچھا دیکھ تیرے لئے میں کپڑا بناؤں گا۔ چند ہی دنوں بعد دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی پر تکلف اچکن پہنائے ہوئے حسب معمول اسے نچا رہے ہیں۔

حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں سے اقبال کے لئے ایک

نہایت [illegible] صورت [illegible] قال لائے۔ اقبال رات میں روتا تو صبح کے
وقت مولینا کا آدمی ضرور آتا کہ رات کو کدو کیوں رویا اسے بھیج دو
اقبال بڑا ہوا تو اکثر کھانے پینے کی چیزیں خود لیکر جاتا مرحوم بہت خوش
ہوتے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں میوے
پھل ہمیشہ بھیجتے رہتے اور کہلا بھیجتے کہ یہ کدو کے لئے ہے۔ وفات سے
سال سوا سال پہلے صحت اچھی نہیں رہی تھی۔ اقبال کچھ لے جاتا تو کہتے
ابے کدو اب میں بیمار ہوں اور بڈھا ہو گیا۔ اب تیری لائی چیز کیسے کھاؤں
اکثر کہا کرتے اقبال کو میرے ہاں بھیج دیا کرو میں اسے عربی فارسی پڑھاؤں
گا۔ اب کدو بڑا ہو گیا۔ اب نہیں ناچے گا اس لئے اب اسے دوسرا ناچ نچاؤنگا۔
اقبال کچھ دنوں تک بہت بیمار رہا۔ میں پریشان رہنے لگا۔ مرحوم نے سنا
تو فرمانے لگے: ارے کدو کا جگر خراب ہے گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں
ڈاکٹروں کی بات میں نہ آؤ یہ کتابی باتیں بتاتے ہیں مریض کو نہیں پہچانتے
پہاڑے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ۔ فائدہ ہوگا لیکن کدو سے کہہ دو
ناچتا رہے۔ توم توم رے باجے توڑی!

میرے مضامین کے بڑے شائق تھے خود پڑھتے اور اپنے مخلصوں
بے تکلف دوستوں کو سناتے میں ملتا تو مضمون کے بارہ میں اپنی
رائے بھی سنا دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ کن کن کو انھوں نے مضمون سنایا اور

کس کس نے کیا کہا۔ لیکن اکثر اس کے خلاف بھی ہوتا۔ ایک دن یونیورسٹی آفس سے اتر کر اسٹریچی ہال کی طرف آرہے تھے، میں سڑک سے گزر رہا تھا سلام کیا بولے: اجی یہ تم کیا مہمل لکھنے لگے ہو۔ اس دفعہ کا مضمون بڑا لغو تھا، ہاں بالکل بے سرو پا۔ اچھا جاؤ اپنا کام دیکھو، میں نے چاہا کچھ کہوں کہنے لگے۔ بس بس آج اتنا ہی وہ دیکھو تمہارا یار آرہا ہے۔ جاؤ!

مرحوم کی سیرت کا ایک خصوصی پہلو یہ تھا وہ جو چیز رکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی اور بہت دل کش ہوتی بڑی قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی ہمیشہ پاکیزہ قیمتی اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے گراں قیمت اور نادر قسم کے ادنی کپڑوں کا بہت شوق تھا۔ شیروانی یا دوکی دار اچکن کا کپڑا بڑا صوفیانہ اور دل کش ہوتا۔ ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی، فاختی رنگ کا کپڑا جس سے ابھرے ہوئے ریشمی پھول کاڑھے گئے تھے۔ ایک دن میں پہنچا تو بولے خوب آئے۔ کچھ وہ عبا تو لانا یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے مالِ غنیمت ہیں۔ عبا لائی گئی بڑے شوق سے پہنا، بولے کیا رائے ہے، میں بہت قریب پہنچ کر دیکھنے لگا۔ آستین پر ہاتھ پھیرا اور ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرنے لگا۔ بولے خیریت تو ہے اس قدر انہماک کا اظہار کیوں کیا جارہا ہے؟ میں نے عرض کیا، کیا کہوں اسی طرح کی ایک چیز اس دن جلسہ میں نواب مزمل اللہ خاں کو پہنے

دیکھا تھا اُن کے قریب تو جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آج آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے اس تختِ طاوس کو ذرا چھو چھا بھی لوں! بڑے زور سے ہنسنے کہنے لگے: باز نہ آوگے! اچھا ایک پان بناؤ اور یہ تو بتاؤ وہ تمھارا یار ذاکر کہاں ہے بڑا مرد آدمی ہے، ذرا صحبت اچھی نہیں ہے میں نے کہا جی ہاں ان دنوں صحبت اچھی نہیں ہے، بولے یہ کیا میں کہتا ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے تم کہتے ہو صحت اچھی نہیں پھر آواز دی جمّا ذرا ایک طشتری میں رشید کے لئے پنڈی تو لانا۔

مرحوم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے، سردیوں میں باہر سوتے تھے، ابتدا میں تو بالکل صحن میں لیکن ادھر چند سال سے برآمدہ میں آرام کرنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر رضائی اوڑھ کر لیتے گداز چادریں ستھری انگلے متعدد۔ پنکھے کا کوئی دستور نہ تھا۔ گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ پسینہ آنا بہت اچھا ہے۔ شام کا نہانا اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے، دوسرے کے تولئے یا رومال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے۔ ننگے سر بمشکل دیکھے جاتے تھے، گفتگو بلند آواز سے کرنے کا نا بھی گوارا نہ تھی، عمامہ اکثر ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا اور جوتی دلّی کی پیرزر۔ ململ کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کرتہ پہنتے جس کے نیچے ہمیشہ ململ کا بٹن دار صدری ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور

وضع کا ہوتا کسی کو اچھا کپڑا پہنے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے، سالن بہت تیز مرچوں کا پسند تھا ہمیشہ چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کھاتے، نوکروں کا بڑا پاس رکھتے لکھنے میں سطر کبھی نہیں سیدھی ہوتی تھی جسے دوست رکھتے اُس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر جی کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش طبعی یا خوش دلی کا فقرہ ضرور کہتے۔ مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی کے اقتدار سے مذہبی عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث، جو جتنا چھوٹا ہوتا اُس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے۔ بڑا ہوتا تو اس سے کہیں اور بڑا ہو کر ملتے، علم کا وقار ان کے دم سے تھا۔ معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا!

قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا تیلے، نقشہ نرم و نازک، آنکھیں چھوٹی جن میں جذبات کا اُتار چڑھاؤ جھلکتا رہتا، نظر تیز و پُر اعتماد انداز میں بانکپن، انگلیاں ایسی جن میں قلم شمشیر در باب سب ہی زیب دیں، آوازیں کڑک اور لچک، دھمک بھی، خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے، نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے۔

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے، جاڑے کے دن تھے، تخ بھری ہوائیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن بن کر اترتی جاتی ہیں

ناظم صاحب دینیات غالباً موجود نہ تھے۔ مرحوم امامت کے لئے آگے بڑھے تکبیر بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولینا نے کہا اللہ اکبر، ایسا معلوم ہوا جیسے اس صدا نے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی۔ اس کے بعد جو قرارت شروع کی ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے خالد کی تلوار میدانِ جہاد میں کوندتی لرزتی گرجتی چمکتی کاٹتی چھٹتی تیرتی ابھرتی، آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ کوئی لمبی سورۃ تھی۔ جب تک ختم نہیں ہوئی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم و جان میں بجلیاں بھر گئی ہیں اور شوقِ خود سپاری میں ہمیں نہیں در و دیوار بھی جھوم رہے ہیں۔ اُس دن کی نماز اب بھی یاد ہے اور ہاں اس پر ایمان بھی ہے کہ وقت آ گیا تو شوقِ شہادت دنیا کے ہر نشیب و فراز اور زندگی کے ہر تامل و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا!!

مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے یا علم کی گہرائی یا وزن نصیب نہیں ہے یا صرف دنیوی اقتدار کا حامل ہے۔ اگر کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجئے آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار!

البیان شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھی بھیجا تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہو گئی۔ البیان کا ذکر

چھڑ گیا۔ سر اقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولینا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع ایسا آیا جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا کہ مولینا دوسرے ایڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہوگا" ایک ذی وجاہت بزرگ جن کو یونیورسٹی کے نظم ونسق میں کافی عمل دخل تھا اور اپنے سن وسال اور قومی خدمات کے اعتبار سے بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی، مرحومین سے ذرا فاصلہ پر دسترخوان پر موجود تھے، وہیں سے آواز دی" ہاں مولینا میری میری بھی وہی رائے ہے جو سر اقبال نے دی ہے، دوسرے ایڈیشن میں...."
اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مرحوم نے للکارا"......... صاحب بس کیجئے، آپ کھانا کھائیے آپ کو ان باتوں سے کیا نسبت، ان باتوں میں نہ پڑئیے کھانا کھائیے ـــــ ملاحظہ فرمایا نا۔ ہاں بس کھانا کھائے جائیے!"

ایک اور بزرگ جن کے بارہ میں کچھ نہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہے دینیات کے نصاب سے دلچسپی لینے لگے، کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ مرحوم تبادلہ خیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا ایک صاحب سے یہ البتہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں، انھوں نے اسی کو

غنیمت سمجھا ایک دن حلقہ چائے نوشی میں آکر شریک ہوئے اور بھیا لوجی
کا تذکرہ چھیڑ دیا مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "آپ کو دینیات سے
کیا واسطہ آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ فرمائیں"
وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہوگئے تھوڑی ہی دیر میں آموں کا تذکرہ آگیا۔
اس میں نو وارد نے بڑے انہماک سے حصّہ لینا شروع کیا۔ مرحوم نے
فرمایا یہ ٹھیک ہے اس پر گفتگو کیجیے۔ ملاحظہ فرماتے ہونا "یہ آپ کا حق ہے!
کچھ دنوں کی بات ہے کہ مرحوم کے ہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے
بزرگ اور بڑے جید عالم ٹھہرے ہوئے تھے آپس میں بے تکلفی تھی ورنہ ظاہر
ہے خانقاہ میں کون بار پا سکتا تھا۔ چلّے کی سردی تھی مرحوم حسبِ
معمول برآمدہ میں سو رہے تھے اور مہمان کمرے کے اندر مہمان تہجد کی
نماز پڑھنے اٹھے۔ دروازہ کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی پوچھا کون؟ جواب
ملا کوئی نہیں میں ہوں۔ بولے خیر تو ہے؟ کہا وضو کروں گا۔ بولے تو کیجیے نا
کسی کی نیند کیوں حرام کرتے ہیں۔ انھوں نے دبی زبان سے کہا، تھوڑا گرم
پانی مل جاتا۔ فرمایا "جہنم میں" مہمان نے کہا۔ مکرر ارشاد ہو پورے طور پر
سن نہ پایا۔ بولے گرم پانی جہنم میں ملے گا۔ انھوں نے جواب دیا وہ تو اٹھو
راہ ہی تیار ہے۔ مرحوم نے قہقہہ لگایا بولے: نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا!
ایک دن کلاس پہنچے خلافِ معمول بہت کم لڑکے نظر آئے۔ پوچھا کیا

بات ہے، معلوم ہوا باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوئی ہے، بڑے معرکہ کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے نے کہا مولینا چھٹی دے دیجئے تو ہم بھی دیکھ آئیں بولے ہاں چھٹی ہے، مقصود حاضری تھی لڑکے نے جواب دیا مولینا حاضری لیجیئے گا تو بہتوں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا حاضری اپنی مقصود تھی تمھاری نہیں جاؤ جاؤ تم بھی میچ دیکھ آؤ!

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں کلاس میں لوائح جامی اور گلشن راز پڑھایا کرتا تھا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے کبھی کبھی اپنی دقتیں لیکر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا، بہت خوش ہوتے کہتے بیٹھو، میں کہتا مولینا کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات ہیں جہاں اٹکتا ہوں فرمایا یہی تو مصیبت ہے تفصیل سے باتیں نہیں سنتے، تھوڑا سا پا لیا اور بھاگ نکلے، طالب علم یہ نہیں کرتے، یہ کام اٹھائی گیروں کا ہے پگڑیاں ہوں یاد گریاں سب اٹھائی گیرے علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے میں نے کہا مولینا گھنٹہ ہونے والا ہے آخر اٹھائی گیروں پر بھی تو بُرا وقت آتا ہے کہتے اچھا اچھا بولو پڑھو، میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ ہی میں روک دیتے کہتے معلوم ہے پھر اس کی وضاحت کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں قرآن پڑھ ڈالو، لوائح جامی اور گلشن راز کلاس میں پڑھا دو گے لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھے لوگوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت چھیڑنا آگے تم جانو تمھارا

کام اور ہاں ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ جائیگی کہتے ٹھہرو ٹھہرو، پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے پڑھنے والے انتظار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ!

ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے ایک صاحب تھے جن کو خانقاہِ سلیمانیہ میں لاالف حمیری کا درجہ حاصل نہ تھا لیکن اکثر بار پا جاتے تھے۔ مولینا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم وفضل کا تذکرہ تھا کہ متذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے، چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دہکتا دہکتا نیم جرعہ لیتے ہوئے فرمایا بھائی میں تو مولینا لطف اللہ صاحب کی کرامت کا قائل ہوں۔ نو وارد نے تعجب میں آکر پوچھا مولینا یہ کیونکر، مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا اور جو انھوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔

کئی سال ہوئے ایک رات گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زنانی سواریاں آئی ہوئی ہیں میں نے کہا چلو مولینا کے ہاں ہو آؤں، پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کلاسکل چھوٹی گول میز کے سامنے اپنی کرسی پر پاؤں اٹھائے اکڑوں بیٹھے ہوئے کوئی چیز بڑے غور سے پڑھ رہے ہیں میں نے کہا مخل تو نہیں ہوا بولے بیٹھ جاؤ ابھی بتاتا ہوں میں بیٹھ گیا، عینک کے اوپر سے نگاہ کرکے بولے ٹھ کاتے ہے بیٹھو

گپ ہو گی تھوڑی ہی دیر میں پرچہ علیحدہ رکھدیا' عینک کو اس کے خانہ میں رکھا پھر بولے سنو ؎

ادھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

بے نظیر شاہ کو جانتے ہو نہ' میں نے کہا جی شاہ صاحب کو کون نہیں جانتا کہنے لگے اور سنو ؎

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

بولے یہ شخص چھوٹی بحر میں کہنے کا بادشاہ ہے' میں نے کہا درست بادشاہوں کا کیا کہنا' بے اختیار ہو کر فرمایا' وہ بھی ٹھیک کہتے ہو' ہاں ہاں ہم سمجھے بادشاہوں کا کیا کہنا'

میں نے کہا تو کیا اسی کا مطالعہ ہو رہا تھا فرمایا نہیں یہ نہیں ایک اشتہار تھا میں اشتہارات اکثر پڑھ لیا کرتا ہوں اس سے تمھاری قوم کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دوا کا اشتہار تھا۔ دنیا میں اور امراض کی دوا کا بھی اشتہار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی مرض ہے' جدھر دیکھو اسی کا چرچا جس طرف دیکھو قوتِ مردمی کا ماتم جہاں دیکھو مایوس العلاج اس سے اندازہ کرو کہ ہمارے کیا کرتوت ہیں' کیا خیالات ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں اور

پھر یہ بھی تو دیکھو تمھاری اُردو کہاں جارہی ہے۔ شروع سے آخر تک یہی اشتہارات یہی امراض میں نے کہا جی ہاں، فرمایا، اچھا اچھا، کھانا کھا لیا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں کہنے لگے یہ بھی اچھا ہوا۔ میں کھا لوں تو گپ ہوگی تمھیں نہیں کھلاؤں گا۔ آج کل صرف ایک پھلکا اور کدو گوشت کا میٹھا پھیکا شوربا ہوتا ہے۔ بھوک لگی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں وہ قائم سی ہوگئی ہے، ہنسے، آواز دی جمّا، نکتیوں کے لڈو لاؤ۔

لڈو آئے تو بولے کھا لو منیر کے ہیں منیر کے منیر کا نام سنا ہے میں نے کہا جی ہاں۔ خط و کتابت بھی رہی ہے، بولے ہائیں یہ کیا؟ میں نے کہا وہی برادرم شمس الدین وزین الدین ہنسے فرمایا خوب یاد رکھا اور ہاں ایک کدو کے لئے لیتے جانا۔ کدو اب بڑا ہوگیا۔ ہاکی کھیلتا ہے۔ خوب ناچتا تھا۔ کدو کہیں کا!

کھانے سے فارغ ہوئے حسبِ معمول صراحی سے براہ راست حلق میں پانی انڈیل کر پیا ہاتھ دھوئے اور سُرخ لمبے چوڑے رومال سے ہاتھ منہ پونچھتے باہر نکل کر چبوترے پہ مونڈھے پر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر تک خلال کرتے رہے۔ میں نے پان بنا کر دیا۔ اسے لیکر منہ میں رکھا، مونڈھے سے ذرا ایک طرف مائل ہو کر پہلی پیک براہِ راست پیتل کے چمک دار اگالدان میں ڈالی جو ٹھیک سوراخ میں جا گری اور اُگال دان کے حاشیہ

پر چھینٹ تک نہیں آئی۔ مرحوم اسی طرح اپنی اونچی کرسی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے نیچے اگالدان میں پیک ڈالتے تھے اور کہیں اِدھر اُدھر اُگالدان پر چھینٹ نہ پڑتی تھی۔

قمری مہینہ کا شاید یہ تیسرا ہفتہ تھا' اکتوبر کا مہینہ' رات کسی قدر بھیگنے لگی تھی چاند اُفق سے کچھ ہی بلند ہوا تھا لیکن اس کا مدھم نم ناک اُجالا درختوں کی پتیوں اور عمارات کے کنگروں پر نمایاں ہو چکا تھا بولے کل رات میری طبیعت گھبرائی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ بالآخر دل میں آیا کہ مُردوں سے گفتگو کروں' کچھ کیا سمجھے میں نے کہا بالکل نہیں سمجھا کہا ہاں مُردوں سے۔ پھر اس کی وضاحت کی فرمایا میں نے وہ پلندہ نکالا جس میں ۲۵۔ ۳۰ برس کے خطوط رکھے ہیں۔ عزیزوں' دوستوں میں سے جو وفات پا چکے ہیں اُن کے خطوط' وہ خطوط جو اُنھوں نے زندگی میں لکھے تھے ان سب کو نکالا بعض بالکل شکستہ تھے بعض کی سواد تحریر بے نور ہو چکی تھی بعض اس طرح لفافوں میں رکھے ملے جیسے ان کو میں نے کھولا ہی نہیں تھا مہریں تک پھیکی پڑ گئی ہیں۔ انھیں میں نے بڑی احتیاط سے کھولا۔ ڈر کر محبت سے کبھی بے اختیار ہو کر کبھی مسرور ہو کر کبھی جھجک کر کھولا ان سے باتیں کیں۔ وہ زمانہ یاد آگیا جب زندگی عبارت تھی ان کے خلوص سے ان کے جھگڑوں سے ان کی فرمائشات سے کسی میں کسی کے آنے کا مژدہ تھا۔ کسی نے بلایا تھا

کسی نے مجھے پریشانی میں تسکین دی تھی۔ پھر میں بالکل بھول گیا کہ یہ لوگ مر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سب زندہ ہیں میں ہی مر چکا ہوں۔

پھر بولے اور نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے تم تو جانتے ہو بھائی صاحب مرحوم پورے پاگل تھے۔ میں نصف پاگل ہوں۔ کبھی کبھی پورا پاگل ہو جاتا ہوں اس وقت ناواقف مجھ سے آزردہ ہو جاتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔

ہاں تو عجیب عجیب خطوط ملے۔ پاگل کا ذہن تم کو معلوم ہے کبھی کبھی ایسا سریع الیسر ایسا شفاف اور ایسا رنگین ہو جاتا ہے کہ بس..... اس کا احساس صرف پاگل ہی کو ہو سکتا ہے تم کو ہوتا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں لیکن ہو کر رہے گا خوش ہو گئے۔ کہا ایک پاؤ اور بناؤ میں ذرا پانی پی لوں پان کھا کر اور پانی پی کر تھوڑا ٹہلے پھر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے یہ ذہن اور اس کے تصورات عجیب ہیں۔ پاگل کی ذہنی سطح ذی حواس کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہے۔ بہت واضح اور نہایت بامعنیٰ۔ وہ تمہاری عقل اور تمہارے اکتسابات شعوری و غیر شعوری سے آزاد ہوتا ہے اس کے تصورات زیادہ مخلصانہ ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پا لیتا ہے۔ نتیجے نہیں استنباط کرتا اس کو نتیجہ استنباط کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہاں تو..... کا خط دیکھ رہا تھا معلوم ہوتا تھا سامنے موجود ہے۔ میں

نے اسے چھوا۔ میرا گھر بنوا رہا تھا۔ محبت سے محنت سے یہاں دوڑ کر جاتا ہے وہاں سے آواز دے رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے رُک گئے۔ پھر بولے ...... کو جانتے ہو۔ میں نے کہا پورے طور پر یاد نہیں کہنے لگے وہ بھی موجود تھے۔ جوں کا توں لفافہ میں بند۔ پھر رُک کے کہنے لگے سب موجود ہیں خوب بات کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ اب قبرستان میں سوتے ہیں لیکن میرے ہاں ہنستے بولتے ہیں۔ سبھوں کو بند کر رکھا ہے ...."

اتنے میں ایک تانگا آیا۔ ایک صاحب نے اتر کر کسی کا پتہ دریافت کیا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے ارد گرد تصورات کی کچھ مرئی کچھ غیر مرئی بھول بھلیاں قائم ہو گئی تھی وہ ایک بیک فضا میں تحلیل ہو گئی۔ بولے بھائی آگے جاؤ یہاں کوئی نہیں میں نے کہا رات زیادہ آئی۔ اب گھر جاونگا کہا جاؤ۔

عرصہ کی بات ہے ایک دن خود بخود فرمانے لگے ہم اس مغالطہ میں مبتلا تھے کہ ہم جیسا خبطی شاید ہی کہیں ملے لیکن ایک ہم سے بھی زیادہ بگڑے دل نکلے۔ صبح کمرے میں سو رہا تھا حسب معمول رضائی اوڑھ کر اور کمرہ بند کر کے۔ ایک صاحب نشست کے کمرے میں آئے دیکھا کوئی نہیں ہے سونے کے کمرہ پہ آ کر دستک دی اور سلام علیک کچھ اس انداز و لہجہ سے کیا کہ میں چونک پڑا۔ رضائی کے اندر ہی سے جواب دیا وعلیکم السلام

انھوں نے فرمایا، مزاج شریف! میں نے کہا ابھی آنکھ لگی تھی، فرمایا مولینا
میں نے آپ کے ملاحظہ کے لئے ایک کتاب بھیجی تھی، جواب میں عرض کیا
گیا بھیجی ہوگی آتی ہی رہتی ہیں۔ بولے آپ نے مطالعہ کیا؟ میں نے کہا یہ
کیا ضرور ہے کہ مطالعہ کی جائے۔ یہ سب کچھ وہ کھڑے کھڑے فرما رہے تھے
اور میں رضائی کے اندر ہی سے جواب دے رہا تھا۔ اتنے میں آواز آئی
مولینا آپ کی دو باتوں کی شہرت سنی تھی ایک اخلاق کی اور دوسرے
علم کی۔ اخلاق کا تو حال معلوم ہو گیا علم کی بھی کسی دن تصدیق ہو جائے گی۔
سلام علیکم! میں گڑبڑا کر چارپائی سے اٹھا اور جلدی جلدی نشست کے کمرہ میں آیا لیکن وہ جا چکے تھے۔

مرحوم دوست بنانے اور معالج انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ایک
دفعہ کہنے لگے سنو جی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا معالج سے فائدہ ہوتا ہے
جب تک معالج "ٹکر کا" نہ ہو مریض کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلہ
میں ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگے ایک دفعہ خیال آیا کہ دلی کے کسی اصلی حکیم
سے رجوع کروں۔ چنانچہ بہت غور و فکر اور تلاش کے بعد ایک ایسے طبیب کا
انتخاب کیا گیا جو طب میں دہلی کے بعض مشہور اطبا کے استاذ رہ چکے تھے۔
اسّی پچاسی سال کا سن بڑے متدین، پرہیزگار اور صاحب کمال تھے۔ ان کے
خیالات بھی عجیب و غریب تھے، یہ ناممکن تھا کہ ان کے مطب میں کوئی شخص
ترکی ٹوپی اوڑھ کر چلا جائے۔ ایک صاحب سوٹ پہن کر آگئے تھے تو ایسے

بچھرے کہ سارا مطب زیر و زبر ہونے لگا اور جب تک وہ چلے نہیں گئے چین سے نہیں بیٹھے۔ کہتے تھے دیکھو تو جہاں میں نماز پڑھتا ہوں وہاں یہ مسخرہ ترکی ٹوپی اور کوٹ پتلون پہن کر چلا آیا۔ مرحوم نے ان سے ملاقات کی بڑے تپاک سے ملے۔ مرحوم نے اپنی شکایات بیان کیں۔ بھوک نہیں لگتی قبض رہتا ہے۔ تبخیر کی شکایت ہے خیالات منتشر اور پراگندہ رہتے ہیں اختلاج کی تکلیف ہو جاتی ہے کبھی کبھی خفقانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے نیند بہت کم آتی ہے وغیرہ

حکیم صاحب سب کچھ بہت غور سے سنتے رہے اور اکثر سر اس طور پر ہلا دیتے گویا ہر بات دل نشین ہوتی جا رہی ہے جب مرحوم کہنا ختم کر چکے تو حکیم صاحب بولے ٹھیک ہے بالکل بجا فرمایا ایسا ہی ہوتا ہے ایسا ہونا چاہیے مرحوم نے فرمایا کوئی نسخہ تجویز فرما دیجئے تو بولے جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شرفا کا مرض ہے شریفوں کو یہی شکایات لاحق ہوتی ہیں مرحوم نے فرمایا آخر کوئی علاج بولے بالکل نہیں کوئی مرض ہو تو علاج کیا جائے اشراف اہنی شکایات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا کالج کھلنے والا تھا مرحوم وطن سے تشریف لا رہے تھے میں الہ آباد میں ملا مرحوم سکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے اور مرحوم کے بڑے بھائی جو عرصہ سے اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے ہمراہ

تھے۔ اسٹیشن پر مجھے دیکھا بولے آجاؤ کھانا کھایا جائے گا۔ میں نے کہا میں سکنڈ کلاس میں کیسے بیٹھوں، کہنے لگے کھانا کھانے کے لیئے ہر کلاس برابر ہے۔ کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا، تم تو آہی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبّہ میں تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور یہ جو "نورٹ ویم" بیٹھا ہوا ہے کہنے لگے گھبراؤ نہیں یار ہے آجاؤ۔ میں اندر آگیا۔

انگریز نے مولینا کی طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولینا کی تجویز سے اتفاق کرتا ہے۔ مولینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ہاں بیٹھے رہو سب ٹھیک ہے۔ سمجھے نا کھانا کھائے گا؟ اس نے اشارہ سے ظاہر کیا گویا وہ ہر طرح راضی و خوشنود ہے۔ کھانے سے البتہ معذور رہے۔

نصف ڈبہ میں مولانا کا سامان رکھا ہوا تھا، ہر طرح کے بکس، بستر، ٹوکریاں ڈبے۔ گٹھریاں، صراحی، پاندان۔ کھانے کا سامان نکالا گیا، ایک پوری برتھ کھانوں سے بھر گئی، ہر طرح کے کھانے ہر ذائقہ کے حلوے مٹھائیاں اُن کے علاوہ۔ کہنے لگے یہ کھاؤ ہماری طرف کی خاص چیز ہے نیب کی کونپل اور کلیاں قیمہ کے ساتھ پکائی گئی تھیں۔ بڑی تیز مرچیں ڈالی گئی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا سالن خالص ہری مرچوں کا تھا، پراٹھے خستہ ٹکیاں اور پوریاں علیحدہ تھیں۔ بڑے مزے سے کھانا کھایا گیا کہنے لگے خوب کھاؤ والدہ نے پکایا ہے یہ نعمت کہاں ملتی ہے سمجھے ہو، ماں نے پکایا ہے۔ ہاں وہ یہ

خیال کر کرکے کیسی خوش ہوتی ہوں گی کہ سلمان کھا رہا ہے، کھلا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی جو سفر حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے کھانے میں شریک ہوتے۔ کیسی ہی پر تکلف دعوت یا معزز مہمان کیوں نہ ہوتے یہ ہمیشہ شریک رہتے تھے۔ مرحوم اُن کو "بھائی جان" کہتے تھے۔ بھائی جان بولتے بالکل نہ تھے۔ دستر خوان پر یک بیک آجاتے اور جو کچھ جی میں آتا اور جس طرح جی میں آتا کھاتے اور فوراً اٹھ کر چل دیتے۔ بھائی جان کی طرف دیکھ کر کہتے۔ کیوں بھائی جان ٹھیک ہے نا۔ وہ حسبِ معمول بالکل جواب نہ دیتے۔ ماں کا نام اور غالباً مرحوم کی جوش محبت اور بھری باتیں سن کر پہلو بدل لیتے اور جلدی جلدی ہر چیز میں ہاتھ ڈالتے کچھ ٹٹولتے اور تھوڑا بہت اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔

اسی زمانہ میں میری والدہ مرحومہ نے رحلت فرمائی تھی مرحوم نے ماں کی باتیں کچھ ایسی وارفتگی سے بیان کرنا شروع کی تھیں کہ میری طبیعت بھر آئی مرحوم نے دیکھا اور بغیر کسی ارادہ یا تکلف یا قطع کلام کئے ہوئے یا کھانے کی طرف سے توجہ ہٹائے ہوئے کہا: ہاں ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن ہونا چکا خیال فرماتے ہولیں ہو چکا بڑی خوش نصیب تھیں کہ تمھارے سامنے مریں۔ تم ان کے سامنے نہ مرے۔ ان کو یاد رکھو ہمیشہ یاد رکھو، ماں

کو کون بھو لتا ہے۔ جب تک نہ بھو لوگے لڑکپن کی خوش دلی اور حوصلہ باقی رہے گا۔ یہ لو پانی پیو۔ سب کچھ ماں کا دیا ہوا ہے اور ہاں یہ لینا یہ آم ...... کے باپ نے دیا تھا۔ کہتا ہے اس کے باغ کے درخت کا پہلا پھل ہے جب تک میں نہ چکھ لوں گا کسی اور کو نہ ملے گا۔ اس میں تمہارا بھی حق پہنچتا ہے۔ یہ ہمارے بہار کا آم ہے۔

اتنے میں فتح پور آگیا۔ کہنے لگے جاؤ اٹاوہ پر پھر ملنا چاے پی جائیگی

مرحوم ہمیشہ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ بڑے سامان و اہتمام کیساتھ سیٹ ہمیشہ ریزرو کرا لیتے تھے۔ مرحوم اس زمانہ سے سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے جب سکنڈ کلاس میں سفر کرنا خاص منزلت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس سامان واہتمام کے ساتھ آج کل میں اچھے اچھوں کو بھی فرسٹ کلاس یا سلون میں سفر کرتے نہیں پاتا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی صاحب وقار سفر کر رہا ہے۔ آسائش کی ہر چیز بڑھیا اور ستھری، ہم سفروں کا رکھ رکھاؤ، لباس واطوار میں صفائی اور خوش سلیقگی جس غرض سے سفر کرتے تھے صرف اسی کو پورا کر کے واپس آجاتے تھے ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ جس خاص غرض سے سفر کیا ہو اس کے علاوہ بھی کچھ اور کر کے واپس آئے ہوں

کچھ ہی دن ہوئے۔ رات کا وقت تھا، باہر چبوترہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے آج تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ یہ تو بتاؤ دل میں کبھی کوئی خطرہ بھی

گزرتا ہے میں نے کہا میں آپ کے سوال کی نوعیت نہ سمجھا. خطرہ سے کیا مراد ہے۔ کہنے لگے مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہم سے یہ اچھا کام نہ ہوسکا حالانکہ ہم ایسا کر سکتے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ تو جانتے ہیں میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا ہوں۔ مجھے ہمیشہ ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے، کہنے لگے، ہاں ہاں وہی بات تو پوچھتا ہوں

میں نے کہا آج علی گڑھ آئے ہوئے ۲۳ - ۲۴ سال ہوئے گھر سے پہلے پہل نکلا تو زندگی کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا. اب خدا کے فضل سے ہر طرح کی کامرانی اور فراوانی حاصل ہے۔ یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے کہ ماں باپ بھائی بہن جو آج سے ۲۳ - ۲۴ سال پہلے موجود تھے سوا والدہ مرحومہ کے سب بقید حیات ہیں اور میری کامرانی سے خوش اور مطمئن۔ لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی یہاں کی ہماہمی، بیوی بچے، دوست احباب، وطن سے دوری اور اس قسم کی بہت سی باتوں نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور شہرت میں شریک ہونیکا حق رکھتے تھے مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں ان حقوق کو میں تھوڑا بہت ادا کرنیکی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہیئے اور جتنا کرنا چاہیئے اس سے اغماض کرتا ہوں بہنیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں بھائی بھی برسر کار ہیں انہیں کوئی آرام سے

بسر کر رہا ہے اور کوئی تنگی ترشی سے والد صاحب گھر پر ہیں۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں تو سب کو دیکھ بھال آتا ہوں۔ والد آرام سے ہیں اور باوجود اس پیرانہ سالی کے اب بھی دوسروں سے خدمت لینے کے بجائے دوسروں ہی کو آرام پہنچاتے ہیں۔ میں جاتا ہوں تو پھولے نہیں سماتے اور اب بھی میرا جی خوش کرنے کے لیئے اور اپنا بھی وہی باتیں کرتے ہیں جو بچپن میں میرے لیئے روا رکھتے تھے۔ میں تھوڑے ہی عرصہ کیلیئے ان سے ملنے جاتا ہوں اور جلد واپس آجاتا ہوں مجھے معلوم ہے اگر میں اُن سے ملنے کیلیئے ذرا دیر اور ٹہر جاؤں تو انکی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں بیوی بچوں میں جلد سے جلد واپس آجانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں اس لئے اشارۃً کنایۃً بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میں تھوڑے عرصہ کیلیئے اور ٹھہر جاؤں۔

میں تھوڑی دیر کے لیئے رُک گیا اور بولا مولینا آپ کے سوال نے دل کے مدتوں کے اٹے ہوئے سوتے کھول دیئے ایسا تو نہیں کہ آپ اُکتانے لگے ہوں علی گڑھ میں اس قسم کے خیالات شاذ و نادر ہی آتے ہیں آپ کے سوال نے معلوم نہیں دل کے کون سے تار کو جنبش دے دی کہ اس وقت طبیعت بے قابو ہوگئی۔ اس گفتگو کو یہیں کیوں نہ ختم کردوں۔ مرحوم پر اس وقت ایک ماورائی سی کیفیت طاری تھی۔ چونک پڑے کہا نہیں نہیں کہے چلو، اب ختم کئے بغیر نہ رُکنا۔

میں نے کہنا شروع کیا۔ سارا قصّہ اس اندیشہ سے نہیں دُہرانا چاہتا کہ دوسروں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک وہ باتیں معلوم نہ ہوں مرحوم کے اُس عمل ذہنی کا اندازہ نہیں ہوسکتا جو میں یہاں بتانا چاہتا تھا۔ میری داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ میری علی گڑھ کی زندگی اس زندگی سے بالکل مختلف ہوگئی تھی جو میں اپنے والدین اور اعزّا کے ساتھ وطن میں بسر کرچکا تھا۔ اس زندگی میں جہاں میں گزشتہ آلام و مصائب کو بھول چکا تھا وہاں اُن ذمہ داریوں کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کرگیا جو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتی تھیں۔ وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں اتنا ان کے رنج و راحت سے میں ملول یا محزون نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

میں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ ان کے مسرت کے پیالہ کو جو بہت ہی اتھلا ہے اپنی ادنیٰ توجہ سے لبریز کردوں لیکن مجھ سے یہ ہو نہیں پاتا۔ نفس حیلے تراشتا ہے تو میں اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں۔

مرحوم گردن جھکائے ساری داستان سُنا کئے میں خاموش ہوگیا تو یک لخت چونک سے پڑے فرمایا بڑی بات کہہ ڈالی اللہ بخشنے والا ہے خوب کہی ٹھیک

کہی میرے دل کی بات کہہ دی۔ اللہ خوش رکھے پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے کمر پر
ہاتھ باندھ باندھ کر سر نیچا کئے دیر تک ٹہلا کئے تھوڑی دیر بعد
کہہ دیتے ٹھیک کہی بڑے پتے کی بات کہی بڑی مبارک بات ہے نئی بات
کہی مرحوم کی اس وقت عجیب حالت تھی کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے عالم جذب طاری
ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے بہت مسرور مطمئن ہیں۔ دیر تک یہ حالت قائم
رہی۔ آخر میں کہا اس وقت جاؤ پھر کبھی اس پر بحث ہو گی۔

مرحوم کالج کے ضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ رات کے وقت پکی
کچی بارکوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ اور آمد و رفت کے لئے صرف
وکٹوریا گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا جس پر دربان مقرر تھا
اور آنے جانے والوں کے نام و پتے لکھ لیتا۔ آدم جی پیر بھائی منزل
(دو منزلہ) کے دروازے جس میں مرحوم تمام عمر مقیم رہے مارلین روڈ پر
کھلتے تھے۔ مرحوم بڑی رات گئے تک بیدار رہتے۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ
کوئی طالب علم یا شخص آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے سے سید محمود کورٹ
میں آ جائے مسجد سے عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آئے اور کچھ لوگ ساتھ ہوتے
تو مرحوم ان کو کبھی اپنی طرف سے باہر نکلنے نہ دیتے۔ ہمیشہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے
کہ وکٹوریا گیٹ سے باہر جاؤ۔ اس میں طلباء یا غیر طلباء کی کوئی تخصیص
نہ تھی۔ اس پر طلباء یا دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوئی

لیکن مرحوم نے اپنے اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا

کم وبیش تیس سال تک دو منزلہ میں مقیم رہے۔ اگر مرحوم علی گڑھ میں موجود ہوتے تو دو منزلہ میں مرحوم کا موجود ہونا بھی یقینی تھا۔ برخلاف دوسرے لوگوں کے یہ ناممکن تھا کہ مرحوم محض تفریحاً یا اخلاقاً کہیں اور ملنے ملانے چلے گئے ہوں۔ ہمیشہ اپنے مستقر پر ملے۔ سوا اس کے کہ کہیں شادی یا غمی کی تقریب ہو یا یونیورسٹی کے کام سے وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر نے طلب کیا ہو یا اپنوں میں سے کوئی بہت بیمار ہو۔ بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو کہ مرحوم نے سوئمنگ باتھ نہیں دیکھا تھا کہتے تھے ادھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی، یہ بات میں نے بہت کم لوگوں میں پائی۔

یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جشن منایا جاتا جلسے ہوتے، مرحوم ان میں کبھی نہیں شریک ہوئے۔ اس پر اکثر پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن مرحوم اپنی جگہ سے ذرا ادھر ادھر نہ ہوئے۔ کہتے تھے یونیورسٹی میں دولت و امارت کا کیا ہیچ۔ ایسے لوگوں کے لئے ساری دنیا پڑی ہے وہیں یہ ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں علم و فضل دیکھا جاتا ہے۔ کوئی صاحب فضل و کمال آئے تو البتہ!

ایک بار کوئی میٹنگ تھی جس میں گفتگو تیز تیز ہونی شروع ہوئی، ایسے موقع پر مرحوم کب قابو میں رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے جو قریب ہی بیٹھے

تھے مولینا کو دبایا کہ خاموش ہو جانا ہی مصلحت ہے۔ مرحوم نے جھلا کر کہا خاموش کیسے ہو جاؤں والس رائے کو ایڈریس نہیں دیا جا رہا ہے علم و ایمان کے مسائل ہیں۔ خیال فرماتے ہونا۔ علم و ایمان کی آزمائش ہے نیازمندی یا اطاعت شعاری کی نمائش نہیں ہے میٹنگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا اور کیوں جی یہ تم بھیگی بلی بنے کیسے بیٹھے رہے میں نے کہا مولینا بس تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی ورنہ آپ دیکھتے کہ بھیگی بلی گربۂ عاجز بن جاتی۔ بڑے زور سے ہنسے پھر فرمایا "لیکن رہتے بلی ہی"

مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے بھی بقول ان کے کھاتا کھلا ہوا تھا۔ خانقاہ سلیمانیہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی مولانا ابوبکر صاحب محمد مقتدی خاں شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر سعید زین الدین صاحب تھے۔ باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب سید بہار الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ مولینا ابوبکر صاحب کے بڑے مداح تھے ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا۔ تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی تو بے نظیر نکلا مولینا ابوبکر صاحب کو منہ کی تکلیف ہوئی اور علالت کسی قدر تشویشناک

صورت اختیار کرنے لگی تو ایک دن بڑی بے قراری سے فرمایا: اللہ شفا دے، یونیورسٹی کیا دور دور ایسا آدمی نہ ملے گا۔ علوم پر بڑی اچھی نظر ہے بڑی گہری نظر ہے، حاضر علم ہے بڑی متوازن شخصیت ہے، نہ رعب کھاتا ہے نہ رعب ڈالتا ہے، یہ بات مولویوں میں ناپید ہے۔ پھر یاروں کا یار ہے۔ کہتے تھے ایسا معلوم ہوا جیسے طبیعت میں گدگدی پیدا ہو گئی کہنے لگے عجیب آدمی ہیں۔ کوئی کام ہو کسی کا کام ہو کسی سے ہو عبا پہنی رومال کندھے پر ڈالا اور ڈنڈا سنبھال کر گھر سے نکل پڑے۔ یہ شخص فرض کو فرض سمجھ کر نہیں پورا کرتا بلکہ اس کے ادا کرنے میں لطف اٹھاتا ہے۔ آج کل دیکھو کس کرب میں مبتلا ہیں لیکن نہ معمولات میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ بات چیت کرنے میں کوئی تردد یا اضمحلال، کتنوں کی ان کے دم سے پرورش ہے۔ ہاتھ کھلا، دل غنی۔ بڑا سردار آدمی ہے!

ذاکر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا چلیے مولینا سے مل آئیں ہم جیسے پہنچے مرحوم استنجا کرنے جا رہے تھے میں کمرہ میں داخل ہوا کہنے لگے "اخوہ یہ سواری باد بہاری کہاں سے آئی" اچھا بیٹھ جاؤ استنجا کر آوں۔ فوراً ہی ذاکر صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔ دیکھتے ہی مسرت سے چہرہ جگمگا اٹھا۔ ایک خاص انداز ترنم سے بولے: "اہو ہو ہو" ذاکر تم کہاں: اہلاً و سہلاً۔ ذاکر صاحب

نے فرمایا عرصہ سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ آج ارادہ کر لیا کہ ضرور جاؤں گا۔
بولے: جزاک اللہ! جزاک اللہ میری طرف مخاطب ہو کر بولے خدا خوش
رکھے انھیں خوب لائے خوب لائے۔ لوٹا زمین پر رکھ دیا۔ میں نے کہا
استنجے سے فارغ ہو آیئے۔ کہنے لگے نہیں اب نہیں۔ ڈاکٹر سے بات ہو گی
اب سب کام ملتوی۔ یہ کہہ کر تخت پر جا کر دو زانو بیٹھ گئے تخت پر مولینا
کم بیٹھتے تھے۔ کوئی ہوتا یا آتا مرحوم معمولاً اپنی آفس کرسی پر گول میز
کے سامنے دونوں پاؤں اٹھائے بیٹھے رہتے یا بیٹھتے۔ تخت پر دو زانو
بیٹھنا خاص ہی خاص مواقع پر ہوتا۔ جب طبیعت نہایت شگفتہ ہوتی
تو تخت پر آ جاتے اور دو زانو بیٹھتے۔ یہ ان ہی کا فقرہ ہے کہ اب
اجلاس تخت پر ہو گا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ لطف صحبت میں کسی قسم کا
خلل آنے نہ دیا جائے گا اور صحبت پورے طور پر گرم ہو گی۔ چائے تیار
کی گئی۔ شفاف سبزی مائل چائے، عنبر کی خوشبو سے معطر، تھوڑی شکر
ملی ہوئی بغیر دودھ کے خوش نما بلوریں فنجان میں۔ اس درمیان میں
کوئی دوسرے درجہ کا آدمی آ جاتا تو اُسے فوراً رخصت کر دیتے اور
کہہ دیتے اس وقت جاؤ پھر کبھی آنا۔

اس دن بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی بڑے لطف کی باتیں
بڑی محبت کی باتیں اور بڑے پتے کی باتیں۔

میں نے بہت کم لوگوں کو مرحوم جیسی پرلطف باتیں کرتے سُنا ہے
برمحل لطائف یا فقروں کی کمی نہ تھی۔ لطیفے خواہ وہ کیسے ہی ہوں بےضغط
زبان کہتے تھے۔ ان کی زبان پر بعض غیر ثقہ فقرے بھی بڑے مزہ کے
معلوم ہوتے تھے۔ میرا ان کا بڑے عرصہ تک ساتھ رہا ہے۔ میں نے ان کو
شاید ہی کبھی ایک ہی لطیفہ یا فقرہ دہراتے سُنا۔ میں ایسوں سے بھی
واقف ہوں جو بڑے لسّان اور طرّار سمجھے جاتے ہیں لیکن دو چار صحبتوں
کے بعد اکثر یہی معلوم ہوا کہ فقرے اور لطیفے رٹے ہوئے ہیں جو موقع
بے موقع دہرا دیئے جاتے ہیں۔ برمحل اور اچھوتا فقرہ چست کرنا ہر ایک
کا کام نہیں ہے۔ مرحوم کو اس میں خاص درک تھا۔

دینیات کے گھنٹہ میں اکثر طلبا لکچر کم سُنتے حاضری کی زیادہ فکر رکھتے
اور تھوڑی بہت تفریح سے بھی باز نہ آتے۔ لیکن مولانا کی کلاس میں نظم و
سکوت قائم رہتا۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم سے طلبا مسرور بھی رہتے
اور مرعوب بھی۔ ایک دن ایک طالب علم نے کلاس میں دریافت کیا
جناب والا! حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولید کو فوج کی سرداری سے
معزول کر دیا تو حضرت خالد نے حضرت عمرؓ سے معزولی کی وجوہ کیوں نہ دریافت
کیں مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "حضرت خالد نے تو جب
وجوہ دریافت نہیں کئے تیرہ سو سال بعد اب آپ کو وجوہ دریافت

کرنے کی کیوں ضرورت پڑ گئی سمجھے نا بندہ نواز ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالا کیجئے، آگے پڑھئے۔"

مولانا اپنی کلاس کے تقریباً تمام لڑکوں سے باخبر رہتے۔ ایک طالب علم کالج میں بہت مشہور رہتے۔ مولانا کی کلاس میں کئی باریوں سے نہیں آئے تھے مولانا نے دریافت کیا" کہاں ہیں وہ بندہ نواز گیسو دراز ؟ ایک طالب علم نے جواب دیا کہ وہ آج کل بہت مصروف رہتے ہیں اور کمرہ سے کم برآمد ہوتے ہیں۔ دوسرے نے کہا فلاں فلاں کلاس میں تو دیکھے گئے تھے ۔ مولانا نے فرمایا"۔ جی ہاں ذرا کہہ دیجئے گا کہ آجایا کریں ۔ ع ۔

میرے غم خانہ میں بھی ہوجائے دم بھر چاندنی"

میں نے انھیں جلال کے عالم میں بھی پایا ہے ۔علم و مذہب پر گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں آجاتے ۔لیکن اس جلالت کی شان ہی کچھ اور ہوتی ۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ علم یا مذہب کے بل پر یا اُن کے ناموس کی حفاظت میں آمادۂ جہاد ہیں ۔تکبّر یا تبختر کا شائبہ تک نہ ہوتا لیکن جب بے تکلف دوستوں کے حلقہ میں ہوتے تو ان کی باتوں میں شگفتگی، رنگینی وزیبائی ہوتی مرحوم یاد آتے ہیں تو میرے ذہن میں ۔

عجم کا حُسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں"

کا نقشہ بھی پھر جانا۔

مرحوم کے بڑے بھائی کا انتقال مرحوم کی رحلت سے کوئی دو سال پہلے علی گڑھ میں ہوا۔ بڑے بھائی جنھیں مرحوم "بھائی جان" یا بھیّا کہتے تھے مدتوں سے جنون میں مبتلا تھے بولنا بالکل ترک کردیا تھا۔ چپ چاپ اِدھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کیلئے تکلیف دہ تھے۔ مولانا مرحوم بڑے بھائی سے اس حال میں جتنی محبت کرتے تھے اور اُن کی راحت کی جزئیات پر جیسی ان کی نظر تھی اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ سکنڈ کلاس میں انھیں ساتھ رکھتے تھے۔ دسترخوان پر معزز سے معزز مہمان کیوں نہ ہوتا بڑے بھائی ضرور بلائے جاتے۔ بڑے بھائی جس طرح جس کھانے کو کھانا چاہتے۔ کھاتے ان کے لئے سردی گرمی کا لباس بڑی محبت اور تکلف سے بنواتے "بھائی جان" ہی کے لئے آدم جی پیر بھائی منزل کی شمالی سمت ایک احاطہ بنوا دیا تھا جس میں ہر طرح کے پھول کے درخت لگوا دیئے تھے برآمدہ میں پھولوں کے گملے تھے۔

بھائی بیمار ہوئے تو مرحوم کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مریض اپنا حال نہیں بتا سکتا تھا، معدہ کی تکلیف تھی، حکیم[1] صاحب معالج تھے

---

[1] شفاء الملک حکیم محمد عبد اللطیف صاحب لکھنوی وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ۔

ان کی شکل یہ تھی کہ معدہ کو آلائشوں سے پاک کرنے کا جو طریقہ مناسب ہو سکتا تھا مثلاً عمل دنیا، اسے مولانا مرحوم برتنے نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے بھیا نے جو بات تمام عمر گوارا نہ کی اُسے آخر وقت میں کیسے ہونے دوں معلوم نہیں وہ کس عالم میں ہوں۔ ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ بول براز کا امتحان یا ان کے اخراج کا طریقہ یا ان کے متعلقات پر گفتگو کرنا خود مولانا مرحوم بالکل نہیں پسند کرتے تھے۔

بھائی کی بیماری میں مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے پہننے اوڑھنے سونے بیٹھنے کی کوئی فکر نہ تھی، لباس میلا، خط بڑھا، اوقات مقررہ میں گڑبڑ گفتگو میں ناہمواری کہتے تھے نفس نے اپنے مطالبات چھوڑ دیئے ہیں۔ حکیم صاحب نے نہایت محبت، ہوشیاری اور جاں فشانی سے علاج کیا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، دوائیں آش جو شربت اور دیگر ضروری چیزیں گھر سے تیار کرا کے بھیجتے۔ ضروری مشاغل سے فرصت پا کر مریض کے پاس آجاتے ہر طرح کے جتن کئے لیکن ایک پیش نہ گئی اور "بھائی جان" مولانا مرحوم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد ایک دن مرحوم خود بخود فرمانے لگے رشید! معلوم ہوتا ہے کہ میری خمیر بھی علی گڑھ ہی کی ہے۔ پہلے اکثر خیال آیا کہ اچھے برے لیکن سب ہی دیکھ لئے اب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں

اور وطن جاکر بزرگوں کی یاد میں بقیہ زندگی بسر کردوں۔ علی گڑھ میں زمین بھی مل سکتی تھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ یہیں مکان بنوالوں اور رہ لیوں، بھیا زندہ تھے تو یہ سب خیال آتے تھے وہ چل دیئے۔ بہت سی ذمہ داریاں ختم ہوئیں تو بعض کمزوریاں بڑھ گئیں۔ اب ٹھان لی ہے کہ بھیا ہی کے قدموں میں جا لیوں۔ خدا زین الدین کا بھلا کرے انھوں نے اپنے قبرستان میں تھوڑی سی جگہ دے دی ہے۔ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں ذمہ داری ختم ہوجائے تو کمزوری سے مغلوب ہوجانا کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔

مرحوم کی صحت کچھ عرصہ سے خراب چلی آتی تھی بڑے بھائی کی وفات کے بعد اس میں بین اضمحلال پیدا ہوگیا تھا۔ پچھلے رمضان میں بخار آیا، معالج کے اصرار کے باوجود روزے رکھنے سے باز نہ آئے لیکن جب طبیعت زیادہ نڈھال ہونے لگی تو روزے ترک کردیئے، مرض نے طوالت پکڑی لیکن کچھ عرصہ بعد افاقہ کی صورت پیدا ہوئی میں بہت دنوں سے حاضر نہیں ہوا تھا، ایک دن کالج سے واپسی پر گیا تو سونے کے کمرہ میں ملے۔ دروازہ کے پاس ہی ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے، کمزوری ضرور تھی لیکن چہرہ روشن تھا، گفتگو آہستہ کرتے تھے لیکن آواز میں خستگی نہ تھی دیر تک بات کرتے رہے جس میں ہراس یا مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ کہنے لگے رشید جو کچھ ہوا ہوا جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ تمہارا حکیم بڑا نیک نظر آدمی ہے خدا اسے خوش رکھے کیا کوئی عزیز کریگا

جو اس نے کیا۔ ایسے لوگ اب کہاں۔ بہت سمجھ دار آدمی ہے۔ صاحبِ فن کی حیثیت سے میں نے اُسے گھبراتے نہیں دیکھا۔ محبت کی وجہ سے البتہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ نوجوان ہے نا عمر گزرنے پر یہ بات جاتی رہے گی۔

مرحوم کی وفات کے بعد ایک دن حکیم صاحب سے گفتگو آئی تو وہ بھی تعجب کرتے تھے کہ ایسے پیچ عقیدہ کا مریض انھوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا کہتے تھے مرحوم کے مزاج کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اُن کا علاج اس وقت تک کوئی کر ہی نہ سکتا تھا جب تک کہ ان کی عجیب و غریب و لیسا او قات متضاد اور جلد جلد بدلنے والی کیفیات سے پورے طور پر آشنا نہ ہو بی نہیں بلکہ ادویات تجویز کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا کہ کون سی دوا کس حد تک مفید ہوگی اور کہاں پہنچ کر وہ مرحوم کے مزاج سے بے آہنگ ہو جائیگی۔

حکیم صاحب کہتے تھے کہ میں نے یہ محسوس کر کے کہ ممکن ہے مرحوم میرا لحاظ کر کے کچھ نہ کہتے ہوں ایک دن میں نے دبی زبان سے یہ کہہ دیا کہ مولینا اب معالج بدل کر دیکھا جائے کیا ہوتا ہے ممکن ہے مرض میری سمجھ میں نہ آتا ہو۔ یا میری تدابیر کارگر نہ ہوتی ہوں حکیم صاحب کہتے تھے مولینا پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی کہنے لگے حکیم یہ سمجھتے ہو گے کہ مولوی مر گیا تو لوگ کہیں گے کہ حکیم صاحب کے علاج سے مرا۔ خبردار خبردار مت گھبرانا علاج تمھارا ہی رہے گا۔ مارنا جلانا تمھارا کام نہیں ہے یہ تو کوئی اور کرتا ہے۔ تم حکمت کرو علاج

کرتے جاؤ۔ بہت ٹھیک علاج کر رہے ہو۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ علاج کیسا ہو رہا ہے۔ علاج قیامت تک نہیں بدلا جائے گا۔ سمجھے نا ؟ ہاں !

ہر شخص نے حتیٰ کہ مولانا مرحوم کے ایسے دوستوں نے جن کو وہ نہایت محترم و عزیز رکھتے تھے اصرار کیا کہ علاج بدل دیا جائے۔ مرحوم نہ مانے اور ہمیشہ یہ کہتے رہے تم لوگ میرے حکیم کو کیا سمجھتے ہو، بڑے معرکہ کا علاج کر رہا ہے میں اپنی جگہ پر بالکل مطمئن ہوں۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ مولانا نے ایک بار فرمایا تھا کہ حکیم اب کے تو جان پر ہو گیا اب بخار آیا تو پھر نہ اترے گا اور ایسا ہی ہوا۔

پچھلی عید میں مرحوم نے مسجد میں نماز پڑھی۔ کمزور ہو چکے تھے۔ میرا اور بعض دوستوں کا عادت سے بہ معمول چلا آتا تھا کہ مسجد سے واپسی پر سب سے پہلے دو منزلہ آتے اور مرحوم سے مل کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے گزشتہ عید کے موقع پر پہنچا تو مرحوم ملاقات کے کمرہ میں احباب و عقیدتمندوں کے ہجوم میں کھڑے تھے۔ اسی وقت مسجد سے واپس آئے تھے تھکن سی محسوس کر رہے تھے فرمایا بھائی معانقہ سے معاف کرو دم لینے کرسی پر بیٹھ گئے اور مصافحہ کرنے لگے میں پہنچا تو اٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا اور اپنے لمبے چوڑے سرخ چھینٹ دار رومال سے پیشانی سے بار بار پسینہ پونچھتے تھے لیکن چہرے پر بشاشت تھی اور آواز میں کراری مرحوم آواز کے لئے اکثر یہ لفظ

رکراراپن استعمال کرتے تھے۔

ماہ صیام آرہا ہے عید بھی آئے گی۔ اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں رمضان کے کتنے مہینے اور عید کی کتنی تقریبیں یاد آرہی ہیں تراویح کے بعد مرحوم کے ہاں کی وہ صحبتیں جب چائے کا دور ہوتا تھا مخلصین کا مجمع لطف کی باتیں! مرحوم کی باتوں میں وقت کتنا جلد جلد گزرتا تھا۔ جو کوئی آتا اس پر محبت کا کوئی فقرہ چست کرتے۔ چائے کی پیالی پیش کی جاتی کسی کے حلیہ پر کوئی فقرہ کہہ دیتے کسی کے لباس کی تعریف کر دیتے کسی کی کارگزاری کی داد دیتے کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر کسی کی رائے لیتے اور مذاق ہی مذاق میں اس کے بعض نازک پہلو اس طور پر بیان کر جاتے گویا وہ بات بھی اس صحبت کی تفریحی گفتگو کا ایک جز تھی۔ عید کی نماز سے واپسی پر حلقہ احباب گرم ہوتا۔ چائے عطر و پان سے ہر ایک کی تواضع کی جاتی۔ ہر شخص کے مذاق کو مدنظر رکھ کر اس سے پرسش احوال کرتے۔ کالج یا پالیٹکس پر کبھی مجمع میں اظہار خیال نہ کرتے اور نہ کسی کو اس قسم کے مسائل چھیڑنے کی ہمت ہوتی۔

دوسری بار مرحوم علیل ہوئے تو روز بروز حالت گرتی ہی گئی۔ اس دوران عرصہ تک میں حاضر نہ ہوسکا۔ دریافت کرنے پر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور مرض قابو میں نہیں آرہا ہے۔ میں اس حالت میں مرحوم کو دیکھ نہ سکتا تھا جس شخص کو تندرستی زندہ دلی ...

تو نہ دیکھ چکا تھا اُسے بے بس و ناتوان دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔ ایک دن مکان پر ایک اہم کام میں مصروف اور پرووائس چانسلر صاحب کے خط کا منتظر تھا کہ نوکر نے آکر خبر دی کہ مولانا صاحب کی طبیعت خراب ہے حکیم صاحب اور دوسرے لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ انا للہ نکلا، گرتا پڑتا وہ منزل پہنچا، ہجوم دیکھ کر دل بیٹھ گیا، کمرہ میں سب لوگ جمع تھے کئی ڈاکٹر بھی بلائے گئے تھے، مشورہ ہو رہا تھا، معلوم یہ ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے غفلت طاری رہنے لگی ہے کبھی کبھی ہوش میں آجاتے ہیں علاج بدلنے پر اب بھی تیار نہیں ہیں میں نے عرض کیا کہ جو کچھ ہونے والا ہے اُسے اب کوئی ٹال نہیں سکتا، علاج بدلنا نہ بدلنا دونوں برابر ہیں۔ دل البتہ نہیں مانتا۔ شاید ڈاکٹری علاج سے نقشہ بدل جائے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر جو مرحوم کے سب سے مقرب و محترم تھے اندر تشریف لے گئے میری اب بھی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا۔ مرحوم کی حالت غیر ہو چکی تھی لیکن پہلے حکیم صاحب سے پوچھا حکیم تم بھی چاہتے ہو کہ علاج بدل دیا جائے حکیم صاحب نے کہا ہاں فرمایا: تو پھر جو چاہو کرو۔

یہ ہو چکا تو دل کڑا کر کے میں بھی حاضر ہوا کسی نے میرا نام لے کر بآواز بلند کہا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ مرحوم نے آنکھیں کھول دیں مجھے یقین نہیں ہے کہ مرحوم نے مجھے دیکھ کر پہچانا ہو۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے پھر یاد دلایا

کہ فلاں آیا ہوا ہے ۔ نہایت نحیف آواز میں فرمایا" اب آئے ہو..... بڑی دیر کردی" اس کے بعد آنکھیں بند کرلیں ۔ ذرا ہی دیر میں پھر ہوشیار ہوئے فرمایا" یہ کیا ہو رہا ہے؟" یہی تین فقرے تھے جو میں نے سُنے ۔

کچھ دیر تک میں کمرہ میں مرحوم کی چارپائی سے لگا بیٹھا رہا ۔ موت کا تصور کبھی کبھی ماضی کے مدھم نقوش کو بہت زیادہ نمایاں کردیتا ہے اتنا نمایاں گویا ان میں ازسرِنو زندگی ڈال دی گئی ہے ۔ مجھے پچھلا زمانہ ایک ایک کرکے یاد آنے لگا ۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اٹھارہ سال قبل میں رہ چکا تھا ۔ مرحوم نے ایک دن اُس زمانہ میں مجھ سے فرمایا کہ اس عمارت کے دو حصوں میں ہم اور تم آباد ہیں میرے لئے موجودہ حصہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے ۔ بھائی جان کو بھی تکلیف ہے ۔ اگر یہ حصہ بھی مل جاتا تو ہم لوگوں کے لئے بڑی آسانی ہوجاتی ۔ میں اسٹاف میں آگیا تھا اس لئے بڑی آسانی سے مجھے اور کمرے مل گئے اور میں وہاں سے رخصت ہوگیا مجھے وہ زمانہ یاد آرہا تھا ۔ اس کمرہ میں معلوم نہیں کیسے اور کیوں وہ باتیں یاد آنے لگیں جن سے زندگی کے بعض بڑے دلکش نشیب و فراز وابستہ تھے ۔ اپنے ہی نہیں مرحوم کے بھی ۔ اُن کے دہرانے سے کیا حاصل ۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں مرحوم بڑے شوق سے آئے تھے ۔ اس میں ان کے شوق کی تمام چیزیں رکھی ہوئی تھیں ۔ یہیں وہ بے تکلف اور مخلص احباب سے بڑے شوق سے ملتے تھے اور ــــــ یہیں سے وہ آج

ہر شوق سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ شخص جو دوسروں کیلئے سہارا تھا آج ہر سہارے سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی خلوص اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں جس سرچشمہ سے ہیں اور کتنے اور تقویت اور بشاشت حاصل کیا کرتے تھے وہ خشک ہو رہا تھا ہمیشہ کے لئے خشک!

میں بیٹھا رہا مرحوم کی حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی جی چاہتا کاش مولانا یک لخت تندرست ہو کر بیٹھ جاتے اور کہتے "خوب آئے بیٹھو گپ ہو گی۔ کدو اب بڑا ہو گیا۔ ناچے گا نہیں۔ پان کھاؤ۔ ایک مجھے بھی دینا" میری وہ حالت تھی جب آدمی دعا نہیں مانگتا۔ شائد مانگ بھی نہیں سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعا مانگنا عبث ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جائے۔ ناممکن ممکن ہو جائے۔ یہ خواہش دعا مانگنے سے بھی زیادہ عبث ہے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ بات جتنی ناممکن ہے اتنی ہی فطری بھی معلوم ہوتی ہے!

میں چلا آیا اور پھر نہ گیا۔ دو دن بعد مولٰینا سلیمان اشرف صاحب کا انتقال ہو گیا!

اور اللہ نے اپنے بہادر کو ہم میں سے اٹھا لیا!

جنازہ کے ہجوم میں قبرستان پہنچا۔ قبرستان سے متصل میدان میں نماز کے لئے جنازہ رکھ دیا گیا اور ان لوگوں کا انتظار کیا جانے لگا جو دفن

میں شریک ہونے کے لئے دوڑتے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق نواب صدر یار جنگ بہادر کو پہنچتا تھا۔ اچانک علالت کے سبب سے موصوف تشریف نہ لا سکے۔ مولینا ابو بکر صاحب منہ کے زخم رہنے کے سبب سے معذور تھے چنانچہ مولینا شفیع صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت جب کہ نماز جنازہ کا مسئلہ زیر غور تھا مجھے مرحوم کی ایک بات یاد آئی عرصہ ہوا مولینا نے مجھ سے ایک بار فرمایا تھا۔ دیکھو دینیات کے پرچہ میں جو نماز جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ دیتا ہوں اس کا سبب جانتے ہو۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ ہر مسلمان جو اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے وہ نماز جنازہ ہے میں مرنے لگوں گا تو مجھے یہ تو اطمینان رہے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالب علم میری نماز جنازہ پڑھائے گا!

اس وقت جبکہ یہ نہیں طے ہو رہا تھا کہ نماز جنازہ کون پڑھائے مجھے مرحوم کی بات بے اختیار یاد آئی اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کا کوئی شاگرد نماز پڑھائے۔ کاش میں ہی پڑھا سکتا۔ لیکن توفیق ہوئی تو بس اتنی کہ جس جگہ مجھے نماز جنازہ پڑھانی چاہیئے تھی۔ وہیں تعزیت کا رزولیشن پڑھ کر گھر واپس آ گیا اور نماز جنازہ کا بدل تعزیت کا رزولیشن رہ گیا!

مولٰنا ابوبکر صاحب (مرحوم)

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دیوانے نے موت پائی ہے!

مولٰنا الحاج ابوبکر محمد شیث فاروقی جونپوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے پیار کرنے والے سے جا ملے۔ نہ دعائیں مقبول ہوئیں نہ دوائیں کارگر۔ وقت ٹلتا رہا لیکن انجام وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ دلی تمنا تھی کہ یہ نہ ہوتا لیکن مشیتِ الٰہی کو کون سمجھ یا ٹال سکا ہے!

آہ وہ زندانی تقدیر (انسان) جسے بانی "تقدیر" بھی کہتے ہیں!

مولٰنا میرے ہم وطن تھے۔ کیا بتاؤں کہ میں ان کو کب سے جانتا ہوں ان کی شخصی خوبیوں کو بچشم خود دیکھا۔ ان کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے بزرگوں سے سنی۔ کتابوں میں پڑھی اور دنوں میں پائی، ابتدائی باتیں تو حافظہ

سکے دور دور از افق پر کسی پرندہ کی موہوم تھکی ہوئی پرواز کی مانند گم ہوتی جارہی ہیں اب ان کو کون واپس بلائے کس دل سے بلائے اور بلانے سے حاصل ہی کیا؟

علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا اُس نے اپنا بنالیا یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکی محبوب ہے نہیں چاہتا کہ اُس کے ادنےٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کی جائے اس نے مجھے میری نظر میں محترم کردیا اس قید سے مخلصی کہاں۔ بہت سی باتوں میں اب علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ جب کسی اچھے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے تو معاً دل میں سوال پیدا ہوتا ہے یہ علی گڑھ کا ہے یا نہیں اگر نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا آدمی علی گڑھ کے فیضان سے محروم رہا اور جب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں کا ہے تو فخر سے گردن اونچی اور مسرت سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ دل کا ایک راز تھا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

پندرہ سولہ سال ہوئے یونیورسٹی میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہوئی میرے ذہن میں یکلخت یہ بات آئی کہ مولینا یہاں آجائیں تو خوب ہو حسن اتفاق سے جلد ہی وطن جانے کا موقع ملا۔ مولینا سے استمزاج کیا۔ اب تک یاد ہے۔ مولینا ایک کھری چارپائی پر لیٹے ہوئے بستر پر سر رکھے لیٹے عالم شوق میں کچھ اشعار

پڑھ رہے تھے میں نے پہنچ کر سلام کیا تو وعلیکم السلام اس لطف سے کہا
جس سے محسوس ہوا کہ میرے آنے کی مولینا کو بڑی خوشی ہوئی اور سلام کا یہ
جواب ایک طویل اور پُرخلوص صحبت کی دعوت ہے۔ ہر ملنے والے سے خواہ
وہ اجنبی اور نو وارد ہی کیوں نہ ہو مولینا کا یہی انداز پذیرائی تھا۔ خود اُٹھ
بیٹھے اور مجھے بھی اپنی ہی چارپائی پر بٹھا لیا۔ اپنے لمبے رومال کو جو
پاس ہی رکھا تھا اس طور پر گھسیٹتے اٹھایا کہ جس جگہ میں بیٹھنے والا تھا اس کو
جھاڑ پونچھ دینا مقصود تھا۔ قدیم زمانہ کے بزرگوں کا یہ خاص انداز تھا۔
بولے کہو علی گڑھ کا کیا حال ہے۔ کب آئے؟ میں نے کہا مولینا ایک بات کہنا
چاہتا ہوں بولے کہو ضرور کہو وہ ان کا مستعدی اور ولولہ سے اس طور پر ہمہ تن تیار
ہو جانا جیسے ضرورت ہو تو کام پورا کرنے کے لئے وہیں سے میرے ساتھ ہو جائیں۔
میں نے کہا علی گڑھ میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہے۔ آپ قبول کر لیتے تو
بہت اچھا ہوتا۔ کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ آپ کا سیاسی مسلک اور ہے
علی گڑھ کا اور۔ فرمایا، مسلک کی تو کوئی بات نہیں، مسلک تو ایک ہی ہے اور
وہ مسلک ہے اسلام کا۔ میں نے کہا: یہ تو میں سمجھتا ہوں لیکن یہ کون سمجھائے اور
سمجھے کہ کون سا مسلک کیا ہے۔ بولے سمجھنے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا صحیح اور سچا
مسلک دریافت کرنے اور اس پر چلنے میں تو ممکن ہے دقت ہو لیکن صحیح اور سچا
آدمی آسانی سے پہچانا جاتا ہے تمہارا علی گڑھ "مصالح" کا شکار ہے۔

مصلحت اندیشی اچھی چیز ہے لیکن مصلحت پرستی تنزل کی جڑ ہے کچھ دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مولٰنا تو پھر بسم اللہ علی گڑھ تشریف لے چلئے۔ وہاں آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ بولے، کیا مضائقہ لیکن میں دوڑ دھوپ کرنے اور سفارش بہم پہنچانے کے چکر میں نہ پڑوں گا۔ میں نے کہا: یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے میں تو صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتا تھا۔

میں چلنے لگا تو بولے، دیکھو اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی نہ کرنا جو تمھارے یا میرے شایان شان نہ ہو میرا شمار کچھ بہت کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے لیکن روپیہ پیسہ کے علاوہ اللہ کا دیا اور بزرگوں کا سپرد کیا ہوا اور بہت کچھ موجود ہے، مجھے نوکری کی خواہش ہے اور نہ ضرورت۔ تم کہتے ہو کہ علی گڑھ چلوں میں بھی سوچتا ہوں کچھ دن یہ شغل بھی رہے تو کیا ہرج علی گڑھ والوں کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملے گا۔ پھر تم ہو ایوب ہیں وغیرہ۔

یاد نہیں آتا کون لوگ اور موجود تھے کس نے کہا کہ مولٰنا آپ کی اور مولٰنا سلیمان اشرف صاحب کی کیسی نبھے گی۔ مولٰنا نے فرمایا: بھائی ٹھیک کہتے ہو یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی میرے ان کے بعض امور میں اختلافات ضرور ہیں لیکن وہ جون پور میں مدتوں رہے ہیں ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف بھی تو ہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ علی گڑھ جا کر وہ کیا سے کیا ہو گئے۔

لیکن اتنا ضرور یقین ہے کہ وہ میری مخالفت نہ کریں گے۔

میں علی گڑھ واپس آگیا۔ سب سے پہلے مولینا سلیمان اشرف صاحب مرحوم سے ملا۔ دیکھتے ہی بولے: کہو پاکٹ میں کچھ ہے؟ اس سے مرحوم کا مطلب یہ ہوتا، کوئی لطیفہ ذہن میں ہے؟ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا: ایک بات آپ سے منوانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ بولے: شاباش اچھے گھر نیوتہ دیا ہے! ارے سلیمان اشرف سے بات منوانا تم کو کسی نے بہکایا ہوگا۔ میں نے کہا: مولینا بہکایا کسی نے نہیں یہ آپ یقین فرمائیے بولے تو پھر ٹھیک ہے خود ہی بہکے ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کہا: مولینا یہ بہکنے بہکانے پر آپ اتنا زور کیوں دے رہے ہیں میں خود بہکا یا بہکایا گیا لیکن آیا تو آپ ہی کے پاس یہ بھی کوئی بہکنے میں بہکنا ہوا؟ مرحوم بڑے زور سے ہنسے پھر فرمایا۔ اچھا اچھا کہو بارلش یا باہم بازی۔ ہاں ہم سمجھا کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے ناظم دینیات کے تقرر کے سلسلہ میں مولینا ابوبکر صاحب کا نام لیا اور اس کے بعد ہی ان کے محاسن زبان پر لانا چاہتا تھا کہ بولے: اچھا اچھا ذرا چپ نہ ہو جاؤ۔ مولوی ابوبکر سے میں واقف ہوں میرے ان کے مسلک میں فرق ہے تم کو یہ باتیں معلوم نہیں لیکن وہ آدمی اونچے گھرانے کا ہے۔ پھر غور میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر تک ہاتھ پیچھے باندھے ٹہلتے اور گنگناتے رہے اس کے بعد بولے: اچھا جاؤ مولوی

حبیب الرحمٰن خاں سے مشورہ کر کے بتاؤں گا۔

کچھ ہی دن بعد مولینا بالاتفاق ناظم دینیات مقرر ہو گئے پندرہ سال تک مولینا نے جس لطیف و ہمدردی وسیع النظری انتظامی قابلیت او عالمانہ رکھ رکھاؤ سے اُس منصب کے فرائض انجام دیئے اس کی نظیر علی گڑھ کے محکمہ دینیات کی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ گو یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا لیکن پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ خواہ کوئی بھی اور کیسا ہی موسم ہو یونیورسٹی میں تعطیل ہو یا نہ ہو مسجد میں پڑھائی اس میں حتی الوسع کبھی ناغہ نہیں کیا۔ دینیات کی لائبریری از سرِ نو مرتب کی۔ دینیات کے نصاب پر نظر ثانی کی مسجد اور متعلقہ عمارات کو ستھرا اور دیکھنے کے لائق بنائے رکھا جتنے دارالاقامے یونیورسٹی اور اسکول سے متعلق تھے ان میں نماز پڑھنے پڑھانے کا باضابطہ انتظام کیا۔ یونیورسٹی میں مذہبی و اخلاقی فضا پیدا کرنے میں انتہائی خلوص و تدبر سے کام لیا۔

مذہبی و اخلاقی فضا ایک غیر متعین تصور ہے مرحوم کا نظریہ اس بارہ میں سب سے علیحدہ لیکن پورے طور پر متعین اور واضح تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ علی گڑھ ان معنوں میں کوئی دینی یا مذہبی ادارہ نہیں ہے جن معنوں میں دیوبند سہارنپور وغیرہ کے مذہبی یا دینی ادارے ہیں۔ یہ ایک دنیوی تعلیم گاہ ہے جس میں

طلباء کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو ضروریات زمانہ میں ان کی کفیل ہو اور دنیوی مطالبات پورا کرنے میں انکی مدد کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مسلمانوں کا بھی ادا ہے اس لئے اس میں صرف اتنا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ہمارے طلباء اسلام کے اعلیٰ تصورات معاد و معاشرت سے آشنا رہیں اور علوم جدیدہ یا معاشرتِ حاضرہ کی زد میں آکر اسلامی شعائر و اسلامی روایات سے بیگانہ نہ ہو جائیں یونیورسٹی میں عبادت سے زیادہ اعتقاد کو صحیح رکھنے کا التزام رکھنا چاہیئے اس کے بعد کی منزل یہ ہے کہ اعتقاد عمل کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہو جس اعتقاد پر عمل کا جامہ ٹھیک نہ آئے وہ اعتقاد نہیں ذہنی تعیش یا گمراہی ہے۔ مسلمانوں کا عمل عبادت ہے عبادت عمل نہیں یہاں یہ چیز ہمارے آپ کے عمل سے پیدا ہو سکتی ہے قواعد کے شکنجوں یا تعزیرات کے خوف سے نہیں۔ مسلمان بنے رہو مسلمان بنتے رہیں گے۔ قواعد قانون بدلتے رہیں گے۔

مرحوم کا سیاسی مسلک جمعیۃ العلماء کا تھا اور جہاں تک شعائر اسلامیہ کا تعلق تھا وہ بدعات شرعیہ کے سخت مخالف تھے۔ فاتحہ پیر پرستی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے بالکل قائل نہ تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ بڑے حامی تھے۔ تمام عمر ان کا لباس گزہی گاڑھے کا رہا۔ سر پہ عمامہ اور پاؤں میں پنجابی جوتہ صرف سخت سردیوں میں کوئی معمولی سا موزہ

پہن لیتے۔

مجھے یاد آتا ہے ایک صحبت میں جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے سیاسی مسلک پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی مرحوم چبوترہ پر اپنی عبا اور عمامہ سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے تھے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے جو جمعیۃ العلماء اور کانگریس دونوں سے بیزار تھا جمعیۃ کے سیاسی مسلک پر نکتہ چینی کی۔ مولینا اُٹھ بیٹھے، کہنے لگے: بھائی انصاف کرو اور حدود سے متجاوز نہ ہو علماء میں ہزار عیب ہی لیکن انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے، آج کل لوگ زیادہ تر تقریر کرتے ہیں تجویز پیش کر دیتے ہیں یا ستیاگرہ میں شریک ہو جاتے ہیں، وہ بھی ایسے زمانہ میں جب حکومت کی مخالفت کرنا کچھ بہت زیادہ نقصان رساں یا تکلیف دہ نہیں ہے، علماء نے تو اس وقت سے آزادی کا علم بلند کر رکھا ہے جب ہندوستان میں آزادی کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ تھا اور آزادی و بغاوت ہم معنے الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کانگریس کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا، علماء پھانسی پر چڑھائے گئے، اُن کے گھر ڈھائے گئے اُن کو کالا پانی بھیجا گیا۔ ان کے عورتوں بچوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے۔ تم لوگ تو ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہو کچھ بیچارے علماء کی بھی تاریخ پڑھی ہوتی، آج ہندو آزادی کے معاملہ میں علماء سے آنکھ

برابر نہیں کر سکتا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں ہندوستان کی تاریخِ جہاد پر مسلسل اور دل نشین تقریر کی۔ علماء کے بہت سے تباہ شدہ خاندان کا حال سُنایا جہاد پر جو نظمیں جب کبھی لکھی گئی تھیں اور ضبط ہوئیں اُن سب کو سنایا جہاد کی تحریک جس طور پر شروع ہوئی جو لوگ شریک ہوئے اور ان کا جو کچھ انجام ہوا سب سنائے پھر بولے: دوستو بُرا نہ ماننا تمھارے مصالح یا تمھاری کمزوری اپنی اپنی جگہ پر چاہے جیسی ہو مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں لیکن ایسا تو نہ کرو کہ جن لوگوں نے ہندوستان اور اسلام کی آزادی میں مصالح کو ٹھکرا دیا ان کو تم ٹھکراؤ۔ زندگی کے لطف اُٹھاتے ہو خوب اُٹھاؤ، خدا مبارک کرے اور برکت دے، مگر ایسی بات منہ سے نہ نکالو جس سے کبھی تم کو ائمہ و اسلاف کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے!

مولانا کی اس تقریر سے حاضرین پر اوس سی پڑ گئی۔ لیکن اس کے بعد ہی مولانا نے گفتگو کا رخ اس طور پر بدل دیا کہ بات آئی گئی ہوئی اور سب لوگ ہنستے بولتے رخصت ہوئے۔ مرحوم نے یہ تقریر کچھ یوں ہی نہیں کر دی تھی بلکہ اس کی تہہ میں مرحوم کے خاندان کی بعض روایات بھی ہیں۔

مولانا کے دادا مولانا سخاوت علی فاروقی محمدی جہاجر مکّی تھے ممدوح شاہ عبدالحی صاحب دہلوی اور امیر المجاہدین مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید نبیرہ

حجۃ اللہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد تھے اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ۔ ان شہیدین سعیدین کے فیض صحبت سے مولانا سخاوت علی رحمۃ اللہ علیہ میں مجاہدانہ سرگرمیاں پیدا ہو گئی تھیں چنانچہ ۱۸۵۶ء میں یہ مردِ مجاہد ہندوستان کو دار الحرب سمجھ کر مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا۔ مولانا سخاوت علی مرحوم کا قائم کیا ہوا مدرسہ قرآنیہ اب بھی جون پور میں قائم ہے جس کی ترقی و نگرانی بتدریج مولانا ابوبکر صاحب مرحوم کے چچا مولانا محمد جنید صاحب مرحوم اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور مرحوم کے والد ماجد مشہور عالم باعمل حضرت مولانا ابوالخیر محمد مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوئی جن کے بعد مولانا مرحوم اس مدرسے کے مہتمم و ناظم ہوئے۔ مولانا سخاوت علی مرحوم نے اپنے عہد میں جیسے جیسے نازک موقع پر دین کی خدمت کی اور ان کے فیضِ صحبت سے جیسے جیسے علمائے دین پیدا ہوئے وہ پورب کے نواح میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

جس صحبت کا اوپر ذکر آیا ہے میں اس میں موجود تھا اور پورے طور پر محسوس کر رہا تھا کہ مولانا جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں اس حرارت کا بڑا دخل ہے جو مولانا کو براہ راست وراثتہً پہنچی تھی۔

مولانا کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوش دلی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ

اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنا یا دوسرے کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہیں گے کبھی مقروفیت سے کبھی ناسازی طبع سے کبھی اپنے نقصان سے کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانے سے۔ پھر کر چکیں گے تو احسان منوانے یا اپنی اہمیت وعظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو ادنے سا کام کریں گے جس کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طور پر کریں گے گویا کوئی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں یا ان پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مرحوم اس کے بالکل برعکس تھے معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا، وہ اس کو اس طور پر کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پر سانس لیتے ہیں۔ بغیر کسی قسم کا اعلان کئے اور بغیر کسی معاوضہ کی توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

شعبۂ فنوں کے ایک طالب علم نے "اکیڈمک کونسل" سے ایک بار ایسے مضامین اختیار کرنے کی اجازت چاہی جو مقررہ اوقات تعلیمی میں مخل ہوتے تھے کونسل میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ارکین نہ تو یہ چاہتے تھے کہ ٹائم ٹیبل کی دقتوں میں اضافہ ہو اور نہ اُس طالب علم کی درخواست کو اسی بنا پر مسترد کرنا گوارا کرتے تھے۔ جب کافی بحث ہو چکی تو مولینا نے فرمایا کونسل اجازت دے دے جس مضمون کی تعلیم کی گنجائش نظام اوقات میں

نہیں نکلتی وہ مرحوم کے سپرد کردیا جائے۔ وہ اپنے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس طالب علم کو پڑھائیں گے چنانچہ اس طالب علم کو مولٰینا نے دو سال تک مسلسل انتہائی پابندی و انہماک سے اپنی فرصت کے اوقات میں تعلیم دی۔

اپنے عملہ میں مولٰینا کو بعض بڑے نالائقوں سے بھی سابقہ ہوا لیکن وہ ان سے اس طور پر نباہ کرتے تھے کہ ہر شخص کو حیرت ہوتی تھی۔ موذنوں اور پیش اماموں کی بڑی خبر گیری کرتے تھے، ان سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے یہاں تک کہ ان سبھوں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ مولٰینا ان کے افسر تھے، ان کے کاموں میں کبھی کوئی عیب یا نقص نہ نکالا اُن کی ذاتی دقتوں کو اپنا لیتے۔ مولٰینا کے سپرد جو انتظامات تھے اُن کا حلقہ بہت وسیع تھا، قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ مولٰینا کسی قسم کے تردد یا دوادوش میں مبتلا ہوئے ہوں۔ کمیٹیاں ہو رہی ہوں کاغذی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہوں اور ایک ہنگامہ برپا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولٰینا کی منشا خود بخود ہر جگہ پوری ہو رہی ہے اور مولٰینا کا ہر ماتحت یا ان کے ساتھ کام کرنیوالا اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہر فرض سلیقہ اور محنت سے ادا کر رہا ہے۔

ایک دن ہم سب سید بشیر الدین صاحب مہتمم یونیورسٹی لائبریری کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے، مولٰینا بھی اپنے خاص انداز دل آسائی و خود اعتمادی کے ساتھ آ گئے، سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولٰینا نے بغیر کسی تکلف یا

مصنوعی اخلاق سے فرمایا: ارے میاں بیٹھے بھی رہو گیا باتیں ہو رہی تھیں
اور کیوں بشیر! ہمارا "صاحب" کہاں ہے؟ (یہ سید محمود حسین صاحب لکچر شعبۂ
انگریزی کی طرف اشارہ تھا) بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ادھر اُدھر
کی باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں بشیر صاحب نے کہا کہ لائبریری کے قلمی
اور مشرقی نسخوں کو حال ہی میں نیو لکچرز روم سے لائبریری کو منتقل کیا گیا ہے
کتابیں بے ترتیب ہو رہی ہیں۔ ان کتابوں کی باقاعدہ فہرست بن جاتی تو بڑا اچھا ہوتا
مولینا نے فوراً فرمایا۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے یہ بھی کوئی کام ہوا طفیل احمد
سے کہو مجھے یہ ذخیرہ دکھا دیں۔ میں فہرست تیار کردوں گا۔ بشیر صاحب نے کہا
مولینا بڑا پتّہ مار کام ہے، آپ کیوں تکلیف کریں مولینا نے فرمایا: بھئی
ذرا دیکھوں تو سہی جس کام کو نوجوان پتّہ مار کہتے ہیں اُسے بوڑھوں کو کم سے
کم دیکھ تو لینا چاہیے۔ غرض مولینا نے کام شروع کر دیا کسی کو کانوں کان خبر
نہ ہوئی تاریخوں مسلسل ہر روز کئی کئی گھنٹے لائبریری کے ایک گوشہ میں بیٹھے کام کرتے
رہے اور بالآخر فہرست مکمل کردی۔ مولینا نے کبھی اس کا بھول کر بھی ذکر نہ کیا
کہ وہ کس کام میں مصروف تھے یہاں تک کہ کام بہمہ وجوہ مکمل ہو گیا اس بات
بھی کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔ ایک عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مولینا
نے فہرست مکمل کردی تو میں نے ہنس کر مولینا سے کہا، مولینا یہ آپ خواہ مخواہ
کا دردِ سر کیوں خریدتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ تم بھی عجیب آدمی ہو یہ بھی کوئی

کام ہوا، بشیر کو اس کی فکر تھی، بس نے کہا کام بھی اچھا ہے فرصت بھی ہے کچھ دن اسی کی سیر رہے۔ اس فہرست کے مرتب کرنے میں مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ بعض نوادر کے دیکھنے کا مفت میں موقع مل گیا۔ اس ذخیرہ میں بعض ایسی کتابیں دیکھنے کو ملیں جن کو میں سمجھتا تھا کہ ناپید ہیں، کسی کا صرف نام سُنا تھا، ان کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ کچھ ایسی بھی ملیں کہ اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا!

اسی طرح دینیات کی لائبریری کو بھی مرحوم نے خود اپنے ہاتھ سے از سرِ نو ترتیب دیا۔ کتابوں کے انتخاب میں بڑی توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے علوم اسلامیہ پر جو کتابیں بیرون ہندوستان شائع ہوتیں مولٰنا کی ان پر خاص نظر ہوتی، ہمیشہ اس فکر میں رہتے کون سی کتاب کہاں شائع ہوئی اکثر پوچھتے رہتے کس یورپین مستشرق نے اسلامی ادب، شاعری یا اس قبیل کے کسی اور موضوع پر تصنیفات شائع کیں۔ ان کے علاوہ مرحوم کو ان کتابوں سے خاص دل چسپی ہوتی جو مذہبی مباحث پر اُردو میں شائع ہوئیں۔

اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زبان تو اردو ہوتی جارہی ہے کیونکہ براہِ راست عربی فارسی سے استفادہ کرنے والے اب صرف وہ لوگ رہ گئے ہیں جو تحقیقات علمیہ کا کام کرتے ہیں ورنہ عام طور پر اب ساری مذہبی معلومات اُردو ہی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ مولٰنا کی وسعت نظر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ان تمام اردو کتابوں کو

دینیات کی لائبریری میں جگہ دیتے تھے جو فلسفہ مذہب، اخلاقیات یا اس قسم کے دوسرے مباحث پر یورپین زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں فرماتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں یونانی کتب کے ترجمہ سے اسلامی تصورات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا۔ اس سے کہیں دوررس نتائج موجودہ عہد میں پیش آنے والے ہیں کیونکہ فلسفہ کی ترقی سائنس کے انکشافات مطبوعات کی اشاعت، ملنے ملانے کی سہولتیں عوام و خواص دونوں کے ذہن و افکار کو بڑی سرعت اور شدت سے متاثر کر رہی ہیں۔ اس لئے ان مطبوعات پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

یونیورسٹی کا قبرستان آج سے دس بارہ سال پہلے بے آب و گیاہ بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ نہ کوئی سایہ دار درخت، نہ وہاں پہنچنے کا ڈھنگ کا کوئی راستہ، نہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی کوئی ستھری معقول جگہ، نہ محافظِ قبرستان کے رہنے سہنے کا کوئی انتظام، نہ میت کے لے جانے کے لئے کوئی تابوت۔ اسی طرح پر یونیورسٹی کی مسجد میں کوئی وضو خانہ نہ تھا۔ لوگ حوض کے گرد بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ ناک تھوک سے پانی کو پاک و محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میت کو غسل دینے اور کفنانے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مولینا نے نہایت خاموشی اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ ان سب کا معقول انتظام کر دیا۔

گورستان کا اب یہ عالم ہے کہ شاید اس سے زیادہ سبز اور سایہ دار
جگہ یونیورسٹی میں کوئی اور نہیں ہے۔ صاف پختہ سڑک بن گئی ہے۔ محافظِ
گورستان مع تمام ضروری سامان کے چوبیس گھنٹہ وہیں موجود رہتا ہے
نمازِ جنازہ کی جگہ متعین ہے اور صفیں بنی ہوئی ہیں اس کا بھی انتظام ہے کہ
دفعتاً کوئی موقع آجائے اور معقول انتظام جلد اور بروقت نہ ہو سکے تو
تکفین و تدفین کا پورا سامان موجود رہے مسجد میں نہایت ہی ستھرا اور خوبصورت
وضو خانہ ایک روشن اور محفوظ برآمدہ میں بنا دیا گیا ہے غسلِ میت اور
تجہیز و تکفین کے لیے مسجد ہی سے ملحق لیکن الگ تھلگ ایک جگہ مخصوص کر
دی گئی ہے۔ یہ انتظامات جتنے ضروری تھے اتنا ہی ان کی طرف ذہن کم منتقل
ہوتا تھا لیکن مولانا کو ان کا پورا احساس تھا اور انھوں نے بعض دشواریوں
کا نہایت خاموشی سے مقابلہ کرکے ان سب کا مناسب انتظام کر دیا۔

ایک بار یونیورسٹی میں اس کا بڑا چرچا تھا کہ لڑکے کثرت سے سینما دیکھنے
جایا کرتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس سے باہر شہر کے اندر رات کے وقت نوجوان
طلبا کا ایسے موقع اور مجمع میں موجود ہونا ہرگز کسی طرح قابلِ اطمینان نہیں
کہا جاسکتا بلکہ اس سے ان کے خصائل و اخلاق پر برا اثر پڑنے کا
اندیشہ ہے اور حکامِ یونیورسٹی کے انتظامات میں بھی بڑی دشواریاں پیدا ہوتی
ہیں۔ اس لیے یہ تجویز ہوگا کہ خود یونیورسٹی کے احاطہ میں سینما ہال کھولنے کی اجازت

دی جائے جس پر یونیورسٹی کے مقرر کردہ قیود عائد ہوں۔

دوسرے یہ کہتے تھے کہ سینما قطعاً مخرب اخلاق ہے اس کے علاوہ خود یونیورسٹی میں اس کا انتظام ہونے دنیا بڑی غلط فہمیوں کا باعث ہوگا اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں "ڈرامٹیک سوسائٹی" پر بھی اعتراضات کئے جا رہے تھے کہ یہ چیز اسلامی درس گاہ میں نہ ہونی چاہئے۔

ایک دن اثنائے گفتگو میں میں نے پوچھا، مولینا اس سینما اور ڈرامٹیک سوسائٹی کے بارہ میں مذہبی نقطۂ نظر کیا ہے۔ مرحوم نے فرمایا: آخر مذہبی نقطۂ نظر کے پیچھے کیوں پڑتے ہو معلوم ہوتا ہے تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مولوی سوا مذہبی نقطۂ نظر کے کسی اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور نہ خود اپنی کوئی رائے رکھتا ہے مجھے یہ تو بتاؤ مذہبی نقطۂ نظر معلوم کرنے کی تم کو اتنی فکر کیوں ہے اس نقطۂ نظر پر عمل کرو گے؟ ہندوستان میں بحالت موجودہ اس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے؟ آخر اس پر کیوں نہیں راضی ہو جاتے کہ مذہبی نقطۂ نظر کے پیچھے پڑے بغیر بھی معقول پسندی اور حسن تدبیر کو دخل دیا جا سکتا ہے! میں نے عرض کیا: مولینا بات تو ٹھیک ہے لیکن میں ذرا کند ذہن اور صلح پسند واقع ہوا ہوں معقول پسندی سے بڑی ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں اُن سے کون نپٹے۔ مذہبی نقطۂ نظر میں یہ آسانی ہے کہ جب جی میں آیا خود جامہ سے باہر ہو گئے اور جب جی چاہا کسی بھلے مانس کی پگڑی اُچھال دی! مولینا اپنے خاص

انداز میں بغیر آواز کی ہنسی خوب ہنسے پھر اپنے رومال سے چہرہ پونچھتے اور رومال کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے، دیکھو اسلام ایک مجموعہ ہے مخصوص معتقدات اور مکمل اعمال کا۔ اس کے ہر جزو کو کل میں دیکھنا چاہئے نہ یہ کہ کل کو نظر انداز کر کے جزو پر کٹ مرے۔ جہاں اسلام کا مکمل متنقل و موثر نظام نافذ نہ ہو وہاں ہر مسئلہ یا ہر تحریک کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا بیکار اور اس کو بروئے کار لانے کی کوشش مضر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اس پر عمل کیا جائے۔ یہ بحث بہت طویل ہے کسی مستقل اور معقول صحبت میں اس پر مفصل گفتگو ہوگی اسوقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب کسی ناگزیر خرابی یا قباحت کا انسداد ناممکن ہو تو انسداد کی نہیں بلکہ اصلاح کی کوشش کرنا چاہیئے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ ڈرامے میں سوانگ بھرنا گانا ناچنا اور مصنوعی حرکات یا باتیں کرنا مردوں کا بالخصوص مسلمانوں کو زیب نہیں دیتیں ورزش تفریح، تعلیم، کارکردگی یا اظہار کمال کی اور بہت سی معقول صورتیں بھی تو ہیں آخر ڈراما ہی کو سب کچھ کیوں سمجھ لیا جائے اچھے ڈرامے لکھو اور اپنی فکر کی رسائی و رسائی کا ثبوت دو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اُسے کرنے بھی لگو۔ فنونِ لطیفہ کو جو معنی بالعموم پہنائے جاتے ہیں اسلام نے اس کو گوارا نہیں کیا ہے لیکن فنونِ لطیفہ کی تعبیر میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں اسلام طبیعت کی آنچ کو نہیں روکتا البتہ اس کی نامعقول تعبیر و تشکیل کا احتساب کرتا ہے مسلمانوں کا جمالیاتی تصور کسی سے کم

نہیں۔ انسانی اعمال و افکار کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہوگا
کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بے سر و پا نہیں ہے۔

علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لئے عزیز ہے کہ اس میں
ہر ذوق کی تسکین و تفریح کا سامان مہیا ملتا ہے۔ جو شخص جس قماش کا ہوگا اسکو
اسی قسم کی مکمل سوسائٹی میسر آجائے گی۔ علی گڑھ کی ہر دلعزیزی کا یہی راز ہے
ورنہ مقامی اعتبار سے علی گڑھ میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ دوسرے بڑے
شہروں کے برخلاف یہاں نہ اعلیٰ درجہ کی دکانیں ہیں نہ مناظر فطرت نہ تفریح گاہیں
یہاں کا کوئی شخص محض تفریح کی خاطر کبھی شہر نہیں جاتا اور نہ کسی کے لئے
یونیورسٹی کی حدود سے باہر دلبستگی کا کوئی سامان ہے۔ ہر شخص کو اپنے ہی
مخصوص حلقہ میں دلچسپی کا سارا سامان میسر آجاتا ہے۔

پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، شوخی شرارت، کھیل کود، رندی و پارسائی غرض
یونیورسٹی کی مکمل زندگی میں جن اسباب یا مواقع کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ
سب یہاں ملتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے جب کبھی اور جہاں کہیں
ایک دوسرے سے ملتے ہیں فوراً بے تکلف ہوجاتے ہیں۔ اُن کو تصنع یا تکلف
کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ اس قسم کے طرز عمل پر قادر ہوسکتے ہیں
وہ جانتے ہیں کہ فریقین ایک دوسرے کی اچھائی بُرائی سے واقف اور
علی گڑھ کی روایات سے آشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے

کبھی اجنبی کی حیثیت سے نہیں مل سکتے۔

مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتفاق سے بھی کسی صحبت میں پہنچ جاتے تو حاضرین میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کوئی اجنبی مخل صحبت ہوا ہے چہ جائے کہ وہ مولوی ہو جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کی چول کسی خانہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے لوگ اور ہر طرح کی سوسائٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخصوص حلقوں کے مخصوص طور طریقے ہوں گے کوئی پھکڑ ہے کوئی سنجیدہ کسی کو سیاسی مسئلہ سے دلچسپی ہے تو کسی کو مذہبی بات سے تسکین ہوتی ہے۔ زندگی کو کوئی کسی زاویہ سے دیکھتا ہے، کوئی کسی زاویہ سے۔ کوئی کچھ ہے اور کوئی کچھ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرحوم یونیورسٹی کے ناظم دینیات تھے جس پر منصب کے اعتبار سے خاص خاص پابندیاں عائد ہوتی تھیں اور انہی پابندیوں کے اعتبار سے اس کے کردار گفتار متعین ہوتے تھے۔ بایں ہمہ یہ عجیب بات تھی کہ مولینا کی غیر متوقع آمد پر بھی لوگ خوش اور بشاش ہو جاتے تھے۔ گفتگو کی روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہ آتا اور لوگ آرزو کرتے کہ مولینا بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔

مرحوم کی سیرت و شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے تھے اور نہ دوسرا متجاوز ہو سکتا تھا۔ مرحوم کو خدا نے ایسا متوازن دل و دماغ دیا تھا اور اُن کی شخصیت اتنی دل آویز تھی کہ

اُن کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور نہ انھوں نے اپنے طور طریقوں سے کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظم دینیات یا عالم دین تھے۔

ممکن ہے میرے محض اتنے سے بیان سے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں اس لئے میں اس کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

فرض کیجئے کسی مذہبی یا اخلاقی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے مولینا کبھی کوئی آیت یا حدیث نہ پڑھیں گے اور نہ ائمہ و اکابر کے اقوال پیش کریں گے وہ بالکل ایک معمولی انسان کی طرح بحث میں حصہ لیں گے اور اپنا نقطۂ نظر اس طور پر پیش کریں گے کہ آپ کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ہمت ہوتی رہے گی اور بحث میں آپ کی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ آپ یہاں تک محسوس کرنے لگیں گے کہ اس سے بہتر کوئی اور موقع اس مسئلہ کے سلجھانے کا نہیں ہے اس قسم کے اکثر مواقع پیش آتے رہتے تھے۔ میں مولینا کی خدمت میں ایک حد تک بے باک تھا اور میری ان باتوں سے مولینا مجھے اور زیادہ عزیز رکھتے تھے ایک بار ایک طویل علمی مذاکرہ کے بعد میں نے مولینا سے عرض کیا مولینا بات تو آپ ٹھیک کہتے تھے لیکن یہ ساری باتیں بدیہہ گوئی و بدیہہ آفرینی کے سلسلہ میں تھیں یا اللہ اور رسول کے کلام سے بھی ان کی سند ملتی ہے۔ مولینا اپنی ذہین اور دلنشین آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہی اپنی مخصوص

ہنسی ہنسنے جس میں آواز بالکل نہیں نکلتی تھی لیکن ہنسی کے زور سے سارا جسم جھٹکے کھانے لگتا تھا پھر فرمایا: تمھارے سوالات بھی خوب ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ رسولؐ کے بارہ میں آج کوئی فیصلہ کُن رائے قائم کرنے والے ہو۔

میں نے عرض کیا: مولینا فیصلہ کُن نہیں فیصلہ ہی کہیئے اس لئے کہ میں فیصلہ تو اکثر کرلیا کرتا ہوں البتہ اس میں ایک بڑی کمزوری یہ رہ جاتی ہے کہ فیصلہ تو میں کرتا ہوں لیکن کُن اللہ میاں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ مولینا اس فقرہ سے بہت محظوظ ہوئے پھر فرمایا: میں جو کچھ کہتا تھا اس کی تصدیق کلامِ الہٰیؒ اور حدیثِ نبویؐ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مرحوم نے آیات قرآنی سنائیں احادیث کا حوالہ دیا غرض ہر بات پورے طور پر منقح کردی۔

مرحوم کا یہ خاص وطیرہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا تو جب تک اُن سے خاص طور پر رجوع نہ کیا جاتا وہ خواہ مخواہ مباحثہ میں شریک نہ ہوتے۔ برخلاف بعض لوگوں کے جن کی عام عادت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ جو کچھ جانتے ہیں اُسے بے تکان بیان ماشروع کردیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ لوگ اُن کے فکر ونظر کے قائل ہوجائیں۔ چنانچہ اس وقت تک نہ چپ ہوں گے جب تک اُن کا مبلغ علم ختم نہ ہوجائے یا لوگ حفاظتِ خود اختیاری میں بھاگ نہ کھڑے ہوں! لیکن جب کوئی بات مولینا سے رجوع کی جاتی تو وہ نہایت خوشی نہایت اطمینان اور نہایت اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے اور علوم واحکامِ دینیہ کے تمام

نکات وضاحت کے ساتھ بیان کرتے بعض مسائل ایسے ہوتے جن پر ائمہ کو اختلاف ہوتا اُسے بھی صفائی و صداقت کے ساتھ واضح کردیتے مرحوم کو علوم دینیہ پر بڑا عبور تھا۔ کتابوں کے حوالے اور اکابر کے اقوال دیانت اور وثوق سے پیش کرتے۔ اُس وقت مجھے یہ حیرت ہوتی کہ یہی مولینا جو اب تک ہم سب کے ساتھ خوش گپی میں مصروف تھے ایک "متبحر عالم" کے فرائض کس خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

مرحوم کو عام طور پر گفتگو کرتے یا رہتے سہتے دیکھ کر کسی کو مشکل یہ گمان ہوتا کہ مرحوم کا علم کتنا حاضر، کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر لکھنے پڑھنے ہی کا شغل رکھتے ہیں، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو "علوم جدیدہ" سے پورے طور پر آشنا ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس امر کا تو پتہ لگا ہی سکتے ہیں کس مبحث میں کس کا کون سا پہلو قوی ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ مولینا مذہبی نقطۂ نظر اس انداز سے پیش کرتے ہیں گویا وہ خالص مذہبی نقطۂ نظر نہ تھا بلکہ اُن کے نقطۂ نظر ہمارا ہی اصول بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے مولینا ہمیں لوگوں میں سے ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں۔ وہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرتے جو موجودہ دور میں مسائل مبہم نہیں بلکہ مسلّمہ فیصلے تھے جن پر تجربات جدیدہ کی استناد

لگی ہوئی تھی۔

علوم اسلامیہ میں جو تبحر مرحوم کو تھا اس سے قطع نظر دیگر علوم و فنون سے بھی مولینا کو بڑی دلچسپی تھی مرحوم کو ریاضی میں بڑا درک تھا۔ میں نے ریاضیات جدیدہ کے بعض کاملین کو یہ کہتے سُنا کہ مولینا کو "ریاضی اور اقلیدس" پر بڑا عبور تھا۔ عربی میں جو ریاضی کا جو سرمایہ ہے اس کا معقول حصہ مولینا کی نظر سے گزر چکا تھا۔ فلکیات سے مرحوم کو خاص لگاؤ تھا۔ رات میں چبوترے پر لیٹے ہوئے جن جن ستاروں کے عجیب و غریب نام عربی فارسی میں آئے ہیں ان سب کو دکھاتے بتاتے۔ ایک دفعہ سمتِ قبلہ کی بحث آگئی۔ مولینا نے قطب تارہ کا مقام اور مختلف متعلقہ ستاروں کو ایک ایک کرکے بتایا عہد پیشیں کے ماہرینِ فلکیات نے اپنے اپنے حساب کی رو سے جن ستاروں کا جو محل یا مقام بتایا تھا اور امتدادِ زمانہ سے ان میں اب جو تفاوت پیدا ہوگیا ہے ان سب کو بڑے لطف و وضاحت سے بیان کیا۔ اسی سلسلہ میں جنتریوں کی مفصل تاریخ اور ان کے اصولِ ترتیب و تدوین بھی سُنائے۔

ایک دن کہنے لگے: اور کیوں جی رشید! غالب کے کلام میں "بنات النعش" کا نام آیا ہے اُن کو دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: جی نہیں۔ فرمایا دیکھوگے میں نے کہا: اب کیا دیکھوں ان کے دیکھنے کا لطف تو غالب جی کے زمانہ میں تھا یونیورسٹی کے زمانہ میں دیکھ کر کیا کروں گا ہوں گی بھی تو یونیفارم ہی میں ہونگی

ورنہ آپ دعوت دیدکیوں دیتے! مولینا بہت لطف اندوز ہوئے
اکثر صحبتوں میں نظیری اور غالب کے کلام پر محاکمہ کیا جاتا۔ اس
وقت معلوم ہوتا کہ مولینا کا فارسی اور فارسی ادب کا ذوق کتنا پاکیزہ اور
سلجھا ہوا تھا۔ مرحوم کے سامنے اردو کا کوئی اچھا شعر پڑھا جاتا تو اکثر
وہ اس سے ملتے جلتے مضمون کا فارسی یا عربی شعر سنا دیتے۔

مرحوم کو صرف عربی فارسی کی ادبیات سے ذوق نہ تھا بلکہ اردو
اساتذہ کے بھی ان گنت اشعار یاد تھے، اشعار مزے لے کر پڑھتے تھے محسن
کاکوروی کی تقریباً ہر مشہور نظم یاد تھی جس کو ایک خاص ترنم سے پڑھتے،
اکثر کہا کرتے تھے کہ مذہبی معتقدات کو لکھنوی شاعری میں جس طرح محسن
نے سمویا اور نباہا ہے وہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

اسلامی قانون وراثت پر بڑی اچھی اور گہری نظر تھی قانون کے
اکثر طلباء فرائض کی تقسیم سمجھنے کے لئے مولینا کے پاس آیا کرتے تھے اور
اُن طلباء کو پورے طور پر مطمئن کر دیتے تھے۔

عرصہ کی بات ہے یونیورسٹی میں ایک ہنوٹ ماسٹر رکھے گئے تھے بڑے
شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے اور اس فن کے امام وقت تھے
مولینا سلیمان اشرف صاحب مرحوم اُن پر بہت مہربان تھے اور اپنے دوستوں
کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی ہنوٹ سیکھیں۔ اکثر اصحاب نے سیکھنا شروع

کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب جن کی نظر سے یہ سطور یقیناً گزریں گی
اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن نماز فجر کے بعد مرحوم گھومتے گھامتے
ان کے گھر جا پہنچے۔ باتوں باتوں میں پوچھنے لگے اور کیوں صاحب کچھ بنوٹ
کی بھی مشق بہم پہنچائی؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں دو چار ہاتھ سیکھے تھے لیکن ادھر
ناغہ ہوتا رہا اس لئے مشق و صفائی کی نوبت نہ آئی پینچ اور پینترے بھی کچھ بھولنے لگا ہوں۔
مرحوم نے فرمایا: اچھا مجھے بتایئے کیا سیکھا تھا چنانچہ انھوں نے دو چار
ہاتھ دکھائے مرحوم نے فرمایا: اچھا آؤ میں مشق کرا دوں ...... صاحب کا بیان
ہے کہ مولینا مرحوم نے اس سلسلہ میں جو داؤ پینچ بتائے اور جس صفائی سے
لکڑی چلائی اور اس کی بندش کی وہ ہر اعتبار سے استادانہ تھی اور صاف
ظاہر ہوتا تھا کہ بنوٹ کے فن میں مرحوم طاق تھے۔

مرحوم کو مردانہ کھیل بہت پسند تھے۔ شکار کے بڑے شائق تھے۔ گولی
بھی خاصی چلا لیتے تھے۔ شکار پارٹیوں میں اکثر شریک ہوتے اور شکار میں
"چلائی" تو وہ ایسی کر لیتے تھے کہ نوجوان دنگ رہ جاتے تھے غلیل چلانے کی
بڑی اچھی مشق تھی۔ اس فن کے رموز سے خوب واقف تھے غلیل دیکھ کر بتا دیتے
تھے کہاں کمزوری ہوتی ہے۔ کسی زمانہ کی بہت اوپر [illegible] کی بانس بہت بانس کی
پھری بہت پسند کرتے تھے۔ بانس چونٹ کا عجیب ملکہ تھا کسی کے ہاتھ میں
اچھی سی پھری [illegible] لیتے تو اپنے ہاتھ میں لیا اسے بڑے شوق سے دیکھتے

بھاتے اور بتاتے کہ بانس کی چھڑی کس طرح بنائی سدھاری جاتی ہے۔ اس کی گرہیں کیسے بنائی جاتی ہیں، کیسے اس پر رنگ پیدا کیا جاتا ہے، کس طرح پختہ کرتے ہیں اور کیا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

ایک بار اُبھرے ہوئے حروف (ریلیف) کی چھپائی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں اس قسم کی چیز رائج تھی۔ اس وقت مشین تو تھی نہیں لوگ ناخن سے اس طرح کی چیز بنا لیتے تھے اور یہ بھی ایک طرح کا فن تصور کیا جاتا تھا۔ پھر فرمایا اب مشق تو رہی نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں، شاید کچھ ہو جائے۔ اس کے بعد ایک معمولی سے کاغذ کے پرزے کو چٹکیوں کی گرفت میں لیکر تلے اوپر کچھ اس طرح ناخن سے کچوکے دیئے کہ تھوڑی ہی دیر میں چند حروف اُبھر آئے جو بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی ڈائی سے اُبھرے ہوئے حروف چھاپ دیئے گئے ہیں۔ فرمایا جب مشق تھی تو پوری عبارت لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو پوچھتے کہاں تھے کیسے ہو، مسکرا کر محبت اور دوستی کے لہجہ میں شفقت کے انداز سے۔ دوستوں کے بارہ میں لطف و مرحمت کا کوئی حیلہ کہتے کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فرزانگی یا شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ و زندگی کی عارضی یا مسلسل مکروہات یا سیرت کے بعض داغ دھبے دھل جاتے یا مدھم پڑ جاتے اور محسوس ہونے لگتا کہ شرافت و اولوالعزمی، خلق و مرحمت دنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑی آسودگیاں

ہیں۔

میرا پرانا مکان مرحوم کے مکان سے بالکل قریب تھا۔ ممتاز ہاؤس کے پورب میں ایک بڑا میدان ہے۔ اس میں ہو کر مولینا کالج اور مسجد جاتے
مئی جون کی علی گڑھ کی گرمی میں جب آگ برستی ہوتی اور گرد و غبار سے فضا تیرہ و تار ہوتی مولینا ظہر کی نماز پڑھانے اس میدان سے گزرتے۔
اسی پابندی وقت سے جیسے گھڑی چلتی ہے۔ بالکل جیسے کوئی مجاہد میدان جنگ میں جاتا ہے نہایت ہی ادنیٰ قسم کی کھدر کی عبا کھدر کی صدری کھدر ہی کا لمبا کرتہ اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ ایک لمبا سا رومال کاندھے پر موسم کی شدت ہوئی اسی سے گلا اور کان چھپائے ہوئے سر پر عمامہ پاؤں میں سرخ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا پنجابی وضع کا جوتہ۔

مولینا کی عمر غالباً ۵۵ سال کی ہو گی جسم و جسامت کے اعتبار سے ممتاز نہ تھے بال کافی سپید ہو چکے تھے لیکن طبیعت ایسی مردانہ پائی تھی کہ ان کسی فعل سے کبھی یہ نہ محسوس ہوا کہ مولینا کی رفتار گفتار یا کردار میں تھکن کا کوئی شائبہ بھی تھا۔ منزلیں مارتے پیدل آتے ہیں اور اپنے لمبے رومال سے پاؤں کی گرد طاقت و اعتماد سے جھاڑ کر کرتی پرتے دیر چارپائی پر بیٹھ گئے نہ زبان سے کوئی ایسا فقرہ کہیں گے اور نہ تیور سے اس کا پتہ لگنے گا کہ تکان غالب اسی طور پر جب اٹھ کھڑے ہوتے تو نہ بوڑھوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر کسا

ہو کر یا آہ کر کے کھڑے ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے تازہ دم اٹھ رہے ہیں۔

ان کا ڈھیلا ڈھالا کھدر کا لباس، سیاہ بیانہ عمامہ، ہاتھ میں ڈنڈا، قدم ملیے اور ہموار جیسے کوئی قواعد پریڈ کر رہا ہو۔ کوئی واقعہ کسی حال میں ہو یہ ناممکن تھا کہ قدم کی لمبائی میں ایک انچ کی کمی بیشی ہو جائے یا رفتار میں جھول آجائے۔ مسجد جا رہے ہوں کلاس پڑھا کر نکلے ہوں، دوستوں کے ساتھ ہوں یا جنازہ کے ہمراہ اس مستعدی سے بڑھتے تھے جیسے ہر بات میں ہر شخص سے سبقت کرنا چاہتے ہیں۔ خوشی ہو یا غمی لب و لہجہ کے مردانہ پن میں فرق نہیں آنے پاتا تھا۔ کوئی محفل ہو کسی شخص کا سامنا ہو مرحوم کہیں جھجکتے نہیں تھے۔ بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ ہمیشہ گفتگو اس طور پر کرتے جیسے کسی اپنے برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں۔ لہجہ میں استواری بات میں صفائی، چہرہ پر مردانگی، انداز میں شگفتہ سنجیدگی۔ آتے تو لوگ خوش ہو جاتے۔ جاتے تو بڑی خوش آیند فضا چھوڑ جاتے۔

میرے مکان کا صدر دروازہ بالعموم کھلا رہتا تھا۔ مرحوم کا معمول تھا کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے، کوئی مہمان ہوا تو اس سے تھوڑی دیر تک گفتگو کی میں آ گیا تو خیر ورنہ اطلاع کبھی نہ کرائی اندر بچے سن پاتے کہ مولینا تشریف لائے ہیں تو بھاگ کر باہر آتے مولینا بھی اسی انتظار میں ہوتے

دور ہی سے کہتے بھاگ آ بھاگ آ اور عبا میں چھپ جا۔ میں آتا تو پوچھتے بتاؤ
منی کہاں گئی ہیں کہتا معلوم نہیں البتہ آپ کے عبا کے نیچے دو پاؤں نظر
آ رہے ہیں۔ کہتے ارے وہ تو چلی گئی اپنے پاؤں چھوڑ گئی۔ یہ کہتے اور
اس کا پاؤں عبا ہی سے ڈھانکتے جاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میدان سے گزر رہے ہیں بچوں نے دیکھ
پایا کہ سب شور مچاتے پہنچ جاتے اور کہتے عبا میں چھپا لیجئے۔ مولینا کتنے
ہی ضروری کام سے جاتے ہوں فوراً ٹھہر جاتے۔ ہر چہار طرف طلبا اور لوگ
آتے جاتے ہوتے مولینا ان بچوں کی فرمائش کو پورا کرتے اور راہ روندگان
سے پوچھتے بتاؤ فلاں بچہ کہاں ہے۔ لوگ بھی ٹھہر جاتے اور مولینا کی اس
تفریح کا تماشا دیکھتے۔ کئی بچے ہوتے اور عبا میں جگہ نہ ملتی تو کسی کو اپنا
ڈنڈا دے دیتے کہ اسے گھوڑا بنا کر دوڑا۔ ورنہ کاندھے سے رومال
اتار کر اس پر ڈال دیتے اور اُسے بھی چھپا لیتے۔

جاڑے میں مقدس کی پوری آستین جو شانہ پر چست اور نہایت معمولی اون
کا مکمل نما کپڑا عبا کی شکل میں استعمال کرتے۔ صرف گرمیوں میں اکثر لمبے کرتے پر ایک
صدری استعمال کرتے لیکن ایسا لباس صرف اپنے گھر پر یا بے تکلف دوستوں
کے ہاں جاتے وقت استعمال کرتے۔ ڈنڈا اور عمامہ البتہ کبھی نہیں ترک کیا۔
ڈنڈے کے سہارے کبھی نہیں چلتے بلکہ اس انداز سے لیکر چلتے تھے گویا سہارا

مقصود نہ تھا بلکہ اس سے اظہار اعتماد و افتخار تھا۔

چندہ دینے، سائل کی امداد کرنے اور اچھی چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا روپئے پیسے کی طرف سے اطمینان نہ تھا لیکن موقع آن پڑتا تھا تو اپنی بساط سے زیادہ صرف کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی قدر آزردہ ہو کر مرحوم سے کہا کہ آخر آپ اس قدر شاہ خرچی پر کیوں اُتر آتے ہیں۔ مولینا مسکرائے فرمانے لگے بھائی دیکھو تو کوئی مانگتا ہے جبھی تو دیتا ہوں یوں تو پھینکتا نہیں پھرتا میں نے عرض کیا آپ کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو گئے ہیں اس لئے بے تکلف مانگ بیٹھتے ہیں، کہنے لگے اچھا سنو ایک عرب کا قصہ تم کو سناؤں۔

ایک عرب کی ملاقات اپنے جانی دشمن سے ہو گئی، عرب کے پاس نہایت اچھی تلوار تھی، دشمن نے تلوار ہی کی فرمائش کر دی۔ عرب نے بغیر کسی تکلف کے تلوار حوالے کر دی۔ بات آئی گئی ہو گی، کسی دوست نے عرب سے کہا کہ یہ حماقت کیوں کی، تم تو نہتے ہو گئے تھے اگر دشمن نے حملہ کر دیا تھا تو کیا کرتے، اُس نے کہا ٹھیک کہتے ہو اتنی سی بات میں بھی سمجھتا تھا لیکن اس کو کیا کروں۔ جب وہ مانگ بیٹھا تو میں کیسے نہ دیتا۔ غور تو کرو وہ مانگ بیٹھا!!

میں نے کم لوگوں کو مولینا جیسا کنبہ پرور اور مہمان نواز پایا۔ ان کا گھر ہر طرح کے مہمانوں عزیزوں اور نوواردوں سے بھرا رہتا۔ میں نے آج تک نہ

دیکھا کہ مولینا کے ہاں دو چار اجنبی نہ موجود ہوں۔ جو کھاتے وہ سب کو کھلاتے چائے، کھانا، فواکہات، غرض اس قسم کی تمام باتیں سب کے ساتھ باہر مردانہ میں ہوتیں۔ یہ مرحوم کے خاندانی روایات میں سے تھا۔ وطن میں بھی مولینا کا گھر ہر طرح کے لوگوں کا ماوی و ملجا تھا۔ جس کا جی چاہے چلا آئے۔ گھر والوں کی طرح رہے سہے۔ کوئی نہ پوچھے گا کہ آپ کون ہیں کیسے آئے کب تک رہیئے گا اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائیگا جو خاندان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سے کوئی تکلف نہ برتا جائے گا۔ اس کا جی چاہے تو وہ ہر صحبت میں ہر گفتگو میں بلا تکلف شریک ہو۔ بالکل یہی نقشہ علی گڑھ میں پندرہ سال تک رہا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ علی گڑھ کے ایک بڑے صاحب اقتدار بزرگ مولینا کے ہاں اتفاقاً آگئے سہ پہر کی چائے ہو رہی تھی۔ مجمع دیکھ کر وہ جھجکے اور دریافت کیا کہ کس کا "ایٹ ہوم" ہے مولینا بھی مجمع ہی میں ملے جلے اکیطرف بیٹھے تھے بولے آجائیے آجائیے یہاں ہر شخص ایٹ ہوم ہے۔ ان بزرگ کو انتہا اس پر تعجب ہے کہ ایک مولوی جسکی آمدنی یا تنخواہ بالکل معمولی تھی اتنا شاہ خرچ کیسے ہوسکتا ہے

مرحوم کو چائے کا بہت شوق تھا۔ تکلف اور اہتمام سے چائے پیتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے ملحق اپنے دفتر کے کمرہ میں کچھ دیر قیام فرماتے۔ مرحوم کے احباب اور معتقدین بھی آجاتے۔ چائے کا دور چلتا۔ سب لوگ لطف و اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے اور مرحوم کی سنجیدہ، پُرخلوص اور شگفتہ باتوں

کے مزے لیتے۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ اُس حلقہ میں بیٹھنے والے اس بات کا فخر و مسرت کے ساتھ اظہار کرتے کہ نماز جمعہ کے بعد مولینا کے ہاں بیٹھے چائے پی اور گفتگو کی۔

رمضان شریف میں جب مرحوم مسجد میں معتکف ہوتے تو بھی یہ ایک خاص بات سمجھی جاتی کہ مولینا سے اعتکاف میں ملاقات ہوئی۔ ہمکلامی و ہم نشینی کا یہ وقت اتنا اچھا گزرتا تھا کہ لوگ اس کو دن کا بہت اچھا واقعہ خیال کرتے تھے مسجد کے شمالی سرے کی آخری محراب میں مولینا معتکف ہوتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں کہیں ملنے ملانے جا نہیں سکتے تھے اس لئے ہر شخص کو اپنے اپنے معمولات میں خلا سا محسوس ہوتا اور بالالتزام مولینا سے ملنے مسجد میں جاتا ہر شخص سے اس کے مذاق کی گفتگو کرتے' عطر پیش کرتے' دو چار باتیں ہنسی کی بھی کرتے اور ایسا ظاہر کرتے کہ نہ روزہ کی کوئی تکلیف ہے اور نہ اعتکاف کی پابندی گراں ہے بلکہ ان دونوں کو وہ ایک ایسا رنگ دے دیتے تھے کہ یہی چیزیں خوش آیند معلوم ہونے لگتیں اور لوگ مولینا کے ہاں جانا اتنا ہی ضروری سمجھتے جیسے سیر و تفریح کے لئے جانا' یہ مولینا کی سیرت کا عجیب پہلو تھا کہ اُن کے "معمولات" دوسروں کے لئے "ادارہ" بن جاتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد مولینا کا اپنے دفتر میں بیٹھنا اور چائے پینا یا اعتکاف میں بیٹھنا مولینا کے معمولات میں سے تھا لیکن دوسروں کے لئے یہی صحبت ایک عادت اور ادارہ کی صورت اختیار

کرلیتی تھی اور جب تک یہ لوگ اس حلقہ میں بیٹھ نہ لیتے تھے ان کے روزانہ پروگرام کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔

موسم سے مرحوم کبھی متاثر نہ ہوئے۔ پنجوقتہ نماز مسجد میں پڑھی اور پڑھائی جاڑوں میں فجر کی نماز اول وقت مسجد میں جاکر پڑھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے مغرب کی نماز پڑھ کر دوستوں میں آبیٹھتے اور عشاء کے وقت رخصت ہو جاتے اکثر ہم لوگ مولینا سے عرض کرتے مولینا کہاں جائیے گا آج تو منشی جی ہی کو امامت کا افتخار حاصل کرنے دیجئے۔ کہتے نہیں بھائی منشی جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگ گھبراتے ہیں طلباء کا سابقہ ایسے سے نہ ہونا چاہیئے۔ تم لوگوں کا جی چاہے تو بیٹھے رہو میں نماز کے بعد آجاؤں گا۔ اکثر منشی جی کو نماز پڑھانے کا موقع دے دیتے یہ محض ہم لوگوں کا دل رکھ لینے کے لئے ہوتا۔

اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ مولینا کسل محسوس کر رہے ہیں یا بڑے لطف کی گفتگو ہو رہی ہے یا کسی کام میں بڑے انہماک سے مشغول ہیں کہ نماز کا وقت آگیا مولینا چاق ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور نماز پڑھانے چل دیں گے، اس طور پر جیسے ان میں نئے سرے سے توانائی پیدا ہو گئی یا کوئی بڑا خوشگوار فرض یاد آگیا لطف یہ کہ ایسے مواقع پر وہ کسی کو ضغط میں نہ ڈالتے اور یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ تو نماز پڑھانے جا رہے ہیں اور لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہیں بلکہ بیٹھوں کا رویہ ہوتا ہے کہ کوئی شرعی فرض بھی بجا لائیں گے تو اس طور پر کہ وہ معمول کو نہ جانے قرار

ملے نہ جائے عافیت۔

ایسے لوگ ہم میں آپ میں اکثر ملیں گے جو فریضۂ مذہبی ادا کرنے کے لئے اس طور پر تیار ہوتے ہیں گویا ان کا عبادتِ الٰہی کے لئے آمادہ ہونا ہی دوسروں پر عذاب الٰہی نازل ہونے کا موجب ہوگا۔ عبادتِ الٰہی یہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کی عبادت کو اپنی تمجید و تسبیح نہ سمجھے بلکہ غافلوں کے خلاف مقدس چغلی سمجھے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں کو سزا دے۔ یہ حیثیت میں "سرکاری گواہ" بن کر جانا زیادہ پسند کرتے ہیں مولینا مرحوم ایسے نہ تھے۔ انھوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ہم لوگ کبھی کبھی دینی یا دنیوی امور میں خوش طبعی یا سہل انکاری کو دخل دے جاتے تو مولینا ہنس کر بڑے لطف و رحمت سے فرماتے "ارے بس کر بھائی بس کر، بڑا شریر ہے اس سے جان بچانی مشکل ہے" لیکن ہم جو کچھ کرتے وہ اس بنا پر ہوتا کہ مولینا ہم کو اور ہم مولینا کو عزیز رکھے وہ جانتے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ مولینا ہم کو ناظم دینیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے عزیز تھے اور مولینا بھی ہم لوگوں کو انسان ہی سمجھتے تھے اور یہی وہ رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو ایک جان دو قالب بنا رکھا تھا ایک دن باتوں باتوں میں کہہ گئے۔ یہاں دوسرے مذاہب عقائد پر زور دیتے ہیں اسلام خیال و اعمال پر نظر رکھتا ہے مسلمان کا ہر فعل گناہ ہے یا ثواب

اس کے بعد جاؤ، جو جی چاہے کرو!

یونیورسٹی کے قانون کے ماتحت نماز نہ ادا کرنے پر جرمانہ ہوتا ہے۔ جن طلبا پر جرمانہ کی سزا عائد کی جاتی وہ معاف کرانے کے لئے مولینا کے پاس آتے ان سے مولینا بڑے لطف و شفقت سے پیش آتے، نہ جھڑکتے نہ گھڑکتے اور نہ ان کو شرمندہ کرتے۔ باتوں باتوں میں نماز نہ پڑھنے کی وجوہ دریافت کرتے پھر کہتے میاں تمھارا یہ زمانہ بے فکری اور آزادی کا بھی ہے۔ اور پابندی و ریاضت کا بھی بڑے ہوگے تو اس زمانہ کی فراغتوں یا غفلتوں کو یاد کر کے مسرور یا ملول ہوگے۔ اس لئے موجودہ زمانہ کو غفلت میں مت گنواؤ۔ اس وقت دکھ درد میں اپنے ماں باپ یا سرپرستوں سے تقویت حاصل کرتے ہو جب بڑے ہوگے تو ماں باپ یا سرپرست کوئی نہ ہوگا اس وقت بھی سہارے کی ضرورت ہوگی وہ ایسا وقت ہوگا جب اس سہولت سے تم کو سہارا نہ ملے گا جو اس وقت میسر ہے۔ اس لئے اسی وقت سے خدا کا سہارا ڈھونڈھو تا کہ موقع پر پچھتاوا نہ ہو۔ جاؤ جرمانہ معاف کیا جاتا ہے۔

کلہ کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا وہی جس کا یقین تھا۔ ایسا یقین جو ٹالنے بہلانے کی حدود سے باہر ہو چکا تھا۔ کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی گئی۔ ڈاکٹر حکیم، وید، سیانے دوانے سبھی سے رجوع کیا گیا۔ مرض میں تھوڑا بہت تغیر ہو جاتا تھا لیکن قابلِ اطمینان

صورت کبھی نہ ہوئی۔ لا علاج مرض اور محبوب مریض کی مسلسل تیمارداری، دوادوش، زیر باری اور ہر دم کا یہ احساس کہ اندوہناک انجام قریب تر آتا جا رہا ہے کیسا مستقل ذہنی کرب ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا اس سے سابقہ ہوا اور خدا نہ کرے کسی کو ایسا سابقہ ہو۔

لیکن مرحوم تھے کہ اپنی جگہ پہ تنہا کھڑے جیسے کوئی مجاہد تنہا دشمنوں کے سامنے ہو تلوار ٹوٹ چکی ہو زخموں سے جسم پاش پاش ہو پیچھے دیوار ہو، سورج ڈوبنے والا ہو اور موت کے پرندے دم بدم بڑھنے والی تو بتو اور تہہ بہ تہہ تاریکی میں چیخ چیخ اور جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہے ہوں۔ دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے مد و جزر ابھرتے مٹتے رہے ہوں گے لیکن لبوں پہ شگفتگی، آواز میں امید و استقامت اور آنکھوں میں روشنی جھلکتی رہی۔ ہراس و نا امیدی کا کوئی اثر نہیں۔ تیمارداروں کو تھپکتے، ملنے والوں کو تسکین دیتے نہ کراہے نہ بیزار ہوئے نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا۔ پگھل گئے لیکن ہلے نہیں۔

رخسارہ میں سوراخ ہو گیا تھا۔ دانتوں سے کچھ چبا نہیں سکتے تھے فقط رقیق غذا پہ مدار تھا وہ بھی کس مصیبت سے فرو کی جاتی تھی، ایک دن میں موجود تھا دودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے جو بار بار رخسارہ کے سوراخ سے نکل جاتا تھا کبھی ناک میں چڑھ جاتا کبھی چھینک یا کھانسی آنے لگتی تھی۔ کپڑا تر بتر ہو رہا تھا

میری طبیعت بھر آئی لیکن مرحوم کے منہ سے کوئی کلمہ مایوسی یا بیزاری کا نہ نکلا اور نہ تھکنے ہارنے کا اظہار کیا۔ مشکل سے دو چار تولے دودھ کے فرو ہوئے ہوں گے لیکن مرحوم نے پیالہ اس انداز سے واپس کیا جیسے آسودہ ہو چکے ہیں یہ صرف تیمارداروں کی دلدہی کے لیئے تھا۔ ہاں یاد آیا اتنا ضرور فرمایا "یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے"

گذشتہ عید میں اس قابل نہیں رہے تھے کہ مسجد جا سکتے۔ چنانچہ مردانہ میں چارپائی پر دھوپ میں لیٹے سامنے تین طرف کرسی اور مونڈھے دور دور تک بچھا دیئے گئے۔ ملنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ جو آتا مولینا کی تکلیف اور معذوری کا خیال کر کے سلام کر کے دور ہی بیٹھ جانا چاہتا۔ مولینا اسے اپنے پاس بلاتے مصافحہ کے لئے خود ہاتھ بڑھاتے ان کی گرفت میں اب بھی توانائی تھی۔ پاس سے عطر اٹھا کر دیتے۔ اس وقت تک گفتگو کر لیتے تھے۔ ہر آنے والے کا خیر مقدم آنکھوں کی پرمعنی و پرمسرت جنبش سے کرتے۔ لطف کے بھی دو چار کلمے کہتے کھرے کوئی بچہ آنکلتا تو اسے اپنے پاس بلاتے اس کی آرائش و زیبائش کی خاص انداز سے داد دیتے۔ خوش دلی اور خوش فعلی کا اظہار کرتے اور اس کو کسی طرح یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ خود کس اذیت میں مبتلا ہیں۔

مرحوم کا معمول تھا کہ عید و بقرعید کی نماز شروع ہونے سے ذرا پہلے جگہ جگہ کھڑے ہو کر تکبیروں کی تعداد اور قیام و قعدہ کے طریق بتلاتے

تھے۔ ان کا ایک فقرہ اب بھی یاد آتا ہے "........ بدوں ہاتھ باندھے رکوع میں چلے جائیے" ہر شخص سے معانقہ کرتے۔ ہزاروں آدمیوں سے گلے ملنا اور خوش دلی کا دامن نہ چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ مسکرا کر آزادی اور شفقت سے گلے ملتے، ملنے میں کسی کو کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی سن رسیدہ سنجیدہ متقشف یا متبحر عالم دین یا صرف مولوی سے مل رہا ہے بلکہ ہر شخص یہ سمجھ کر ملتا اور ملنے کے بعد محسوس کرتا کہ وہ ایک اچھے آدمی اور مخلص و خوشباش دوست سے مل رہا ہے یا مل چکا ہے۔ گزشتہ ہی عید کا موقع تھا حاضرین میں سے کسی صاحب نے کہا مولانا آج عید میں آپ کو نہ دیکھکر طبیعت بہت اُداس ہوئی۔ مسکرا کر فرمایا، انشاء اللہ آئندہ عید میں اس کا موقع ملے گا۔ اس حالت میں بہت کم لوگ اس طرح کا فقرہ بے ساختگی سے کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کے قویٰ اتنے اچھے اور ان کا مزاج طبعی اتنا صحیح کہ مرض اپنے شدائد کے آخری حدود تک پہنچ گیا لیکن مرحوم کو عوارض متعلقہ میں سے کسی کا سامنا ہوا کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی خلش نہیں پیدا ہوئی۔ مدتوں اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے رہے اور اس دم خم کے ساتھ کہ کسی کو اصل مرض کا علم نہ ہو تو وہ صرف یہ اندازہ کر سکتا کہ کوئی معمولی سائیوڈ ر ایفیشی ہے جس پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اس عمر اور اس مرض میں نظام جسمانی کا ایسا توازن اور

قوت ارادی کی یہ پختگی حیرت انگیز ہے۔

جب تک بالکل ہی صاحب فراش نہ ہو گئے فرائض متعلقہ پابندی اور تن دہی سے بجا لاتے رہے۔ ایک بار پرو وائس چانسلر صاحب مولینا کو دیکھنے گئے۔ مرض شدت پر تھا۔ گفتگو مشکل سے کر سکتے تھے۔ زنان خانہ میں ملاقات ہوئی۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے چاہا کہ کچھ تسکین اور ہمدردی کے الفاظ کہیں۔ مولینا نے سبقت کی۔ اور مسجد کے جنوبی سلسلہ عمارات میں ترمیم کا نقشہ پیش کیا۔ اسی دوران میں مسجد کے بعض دیگر انتظامی مسائل بھی چھیڑ دیئے اور اس اعتماد سے گفتگو کی جیسے کوئی شخص تندرستی کی حالت میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایسا ہو گیا تو اس کے کارناموں میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ پرو وائس چانسلر صاحب چلنے لگے تو چند کلمات تسکین و ہمدردی کے کہے۔ مرحوم نے ان کلمات کی قدر کی لیکن اس طور پر بالکل نہیں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے بلکہ اس بشاشت اور دلیری سے جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہی نہ تھے۔

مولینا سلیمان اشرف صاحب مرحوم کے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک بڑی پامردی سے گئے وہاں نماز جنازہ پڑھانے کا سوال اٹھا تو اس بنا پر معذوری کا اظہار کیا کہ رخسار کے زخم سے پیم آتی تھی لیکن ان کے بشرہ

سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس معذوری کا کیسا شدید صدمہ تھا۔
قبرستان سے واپس ہوتے ہوئے فرمایا، اس آخری خدمت کے بجا لانے کا
افسوس ہے۔ سردار اُٹھ گیا۔

اسٹریچی ہال میں کسی کی پذیرائی کی تقریب تھی مرض کی ابتدائی حالت
تھی لیکن تکلیف بہت تھی۔ اس موقع پر مولینا کو جلسہ کے افتتاح کے سلسلہ میں
کلامِ پاک کی تلاوت کرنی تھی۔ ہم سب نے عرض کیا کہ مولینا آپ تکلیف نہ فرمائیے
کوئی اور تلاوت کردے گا۔ فرمایا نہیں، کوئی مضائقہ نہیں، ایسی بھی کیا
تکلیف کہ کلامِ پاک کی چند آیات نہ تلاوت کرسکوں چنانچہ مولینا ٹھیک
وقت پر اسٹریچی ہال پہنچے سر اور رخسار پر پٹی بندھی ہوئی تھی چہرہ تکلیف سے
تمتمایا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا تو اپنا ڈنڈا ٹیکتے ہوئے ڈائس پر پورے وقار
اور مستعدی سے آئے۔ آواز میں کہیں تزلزل یا تذبذب نہ تھا۔ چند آیتیں
تلاوت فرمائیں اور براہ راست مکان واپس آگئے۔

مرض بہت بڑھ چکا تھا ایک دن شام قریب تھی سب لوگ بیٹھے ہوئے
تھے کہ اتنے میں ہم سب کے بڑے دیرینہ شناسا ایک افغانی پٹھان آگئے۔ جو
مشک زعفران، بعض ادویات، شال اور سمور وغیرہ کی گشتی تجارت کرتے تھے
حاضرین پر ایک طرح کی اُداسی چھائی ہوئی تھی خان کا غیر متوقع ایسی حالت
میں آنا ہم لوگوں کو گراں گزرا لیکن مولینا نے اس ضعیف کو بڑے لطف و محبت کے

ساتھ دور گیا لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا دیا۔ مصافحہ کے بعد اشارہ سے مزاج پرسی کی اور لمحہ بھر بعد لڑکھڑاتی آواز میں لیکن لطف کے ساتھ پوچھا کیوں خان ہمارے لئے کیا لائے' خان نے جواب دینے میں تامل کیا تو بولے زعفران اور مشک لائے ہو۔ خان نے کہا مولینا اللہ آپ کو شفا دے سب کچھ حاضر کروں گا۔ مرحوم نے بڑے شوق سے ساری چیزیں دیکھیں اور بہت کچھ خریدیں۔ اسی لطف و شوق سے جیسا کہ تندرستی میں کیا کرتے تھے۔

مسلسل مصائب بالخصوص بیماری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں کو اُبھار دیتی ہے آدمی زود رنج اور تنگ مزاج ہو جاتا ہے' صحت و عافیت میں جن لوگوں کی طبیعت متوازن ہوتی ہے' مرض و مصیبت میں بالعموم یہ توازن قائم نہیں رہتا۔ میرا اور مولینا کا مسلسل دن رات کا پندرہ سال تک ساتھ رہا۔ میں نے ایک دن بھی یہ نہ دیکھا کہ مولینا کسی پر برہم ہوئے ہوں یا زبان سے کوئی غیر ثقہ کلمہ نکلنے دیا ہو' بچوں پر' چھوٹوں پر' نوکروں پر' بعض نامعقول لوگوں پر آدمی کبھی نہ کبھی غصہ کرتا ہی ہے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مولینا کبھی کسی حال میں آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ کم سے کم میں نے ان کو کبھی اس حال میں نہ دیکھا ہمیشہ سنجیدہ یا شگفتہ پائے گئے۔

اس مسلسل و مہلک بیماری میں وہ ہر مرحلہ سے گزرے' ہر طرح کی سختیاں جھیلیں۔ توقعات کے خلاف اس سلسلہ میں ان کو مایوسی بھی ہوئی

سخت زیر بار ہوئے بعض صدمے بھی اٹھائے لیکن کوئی ناملائم کلمہ کسی کے خلاف کبھی نہ نکالا۔ تیور سے بھی کبھی مایوسی یا بیزاری کا اظہار نہ کیا ایک دن تکلیف زیادہ تھی تھوڑی بہت گفتگو کر لینے پر قادر تھے لیکن تکلیف کا ایسا غلبہ تھا کہ گفتگو کرنے کا یارا نہ تھا۔ اتفاق سے اُسی دن ایک معزز بزرگ ملنے تشریف لائے اور مولینا سے ہمدردی کی گفتگو شروع کردی مولینا نے فرمایا الحمدللہ اچھا ہوں۔ جواب میں یہ کلمہ ہمیشہ مولینا کی زبان سے نکلا فرید گفتگو ہوئی تو فرمایا دیکھیے تو کتنی عمر پائی اور کس فراغت وعزت سے زندگی بسر ہوئی۔ آخر کوئی وقت تو آتا جب یہ دور ختم ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس حال میں ہوں۔ ممکن تھا کہ اس سے بھی بدتر حالت ہوتی۔

جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو زنان خانہ سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔ ملنے والے وہیں مل آیا کرتے۔ میں عرصہ سے دیکھنے نہیں گیا تھا۔ یہ میری نامعقول کمزوری ہے میں ایسی حالت میں کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ آدمی بھیج کر بلوایا، اندر پہنچا تو تخلیہ تھا میں نے ذرا دور بیٹھنا چاہا اشارہ سے قریب بلایا اب گفتگو کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی تھی اس لئے خود میں نے کچھ نہ کہا۔ ہاتھ اور آنکھ کے اشارہ سے پوچھا کہاں تھے۔ میں نے عرض کیا۔ مولٰنا بس یوں ہی نہیں آنا ہوا، خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا، حالانکہ خیریت دریافت کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی اس لئے کوئی اطمینان بخش

خبر کبھی نہ ملی۔ اور نہ اس کی توقع ہوتی لوگ جو کچھ آپس میں تذکرہ کرتے اسی پر اکتفا کر لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ تذکرہ ختم ہو اور کوئی دوسری بات شروع ہو جائے۔ مرحوم تھوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے پھر بڑی کوشش سے اٹک اٹک کر نا صاف لفظوں میں فرمایا' پریشان نہ ہو اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جاؤں گا۔

اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بے اختیار کہنا شروع کیا۔ مولینا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا سب کر دیکھا۔ اب کچھ بن نہیں پڑتی اپنے بس کی چیز تو روپیہ پیسہ دوڑ دھوپ محبّت اور ماتم ہی ہے۔ یہ سب بے کار ثابت ہوئے اب تو صرف دیکھنے رہنا رہ گیا ہے۔ اس کی بھی ہمّت نہیں رہی۔ مولینا بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دیر تک پکڑے رہے۔ داہنا ہاتھ خالی تھا اُسے اُٹھایا اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلوگیر ہے ہلکے سے کھانس کر گلا صاف کیا اور بولے "وہ دیکھتا ہے"۔

میں چلا آیا۔ یہ آخری ملاقات تھی تعطیلوں میں میں پہاڑ چلا گیا جس رات کو روانہ ہونے والا تھا طبیعت کا عجیب حال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ مولینا کو آخری بار دیکھ آؤں، اس لئے کہ سمجھتا تھا کہ اب دائمی مفارقت کی ساعت دور نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے میں اس کی سکت نہ پاتا تھا

کہ یادداشت کی اس آخری نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جا سکے گی۔
دیر تک اسی حیص بیص میں رہا۔ بالآخر اس فیصلہ پر پہنچا کہ سلام کر ہی آؤں
وہاں پہنچا تو در و دیوار اور وہ تمام چیزیں اشخاص اور یادگاریں ایک
غمناک ہجوم میں بڑھتی پھیلتی دل و ذہن پر چھا گئیں جن سے سالہا سال
سے سابقہ تھا۔ ہمت چھوٹ گئی اور سلام کئے بغیر لوٹ آیا۔ تعطیلوں
بعد واپس ہوا تو مرحوم اپنے وطن جا چکے تھے اور وہیں سے مقررہ
وقت پر نہ ایک ساعت اِدھر نہ ایک ساعت اُدھر جوار رحمت میں
پہنچ گئے۔

مرحوم اصغر گونڈوی

اندازہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا برے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں۔ ماں باپ بھائی بہن احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لئے زیادہ عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی ذات نے ان کو عزیز تر و گرامی تر بنا دیا تھا۔

اصغر صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مدرسۃ العلوم کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوئی تھی عجیب اتفاق

یہ ہے کہ مولینا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) ہی کے توسل سے ہوئی جنہوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی۔ اسوقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے نا آشنا تھا۔ مولینا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ مولینا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لائے۔ میں گھر میں تھا سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے ورد زبان کرتا آیا اس لئے کہ میں نے مولینا سہیل جیسا بے پناہ و برجستہ گو اور دقیقہ سنج آدمی اب تک نہیں دیکھا وہ عالمانہ نکتوں اور مجلسی فقروں کو اس لطف کے ساتھ ایک دوسرے میں سموتے ہوئے برمحل و مسلسل چست کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کرجاتی ہے میں جانتا تھا کہ انھوں نے پہل کردی تو ان کا قابو میں لانا نا ممکن ہوجائیگا اس لئے میں گھر سے تیار ہو کر نکلا تھا میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے کمرہ چھوٹا تھا دروازے بند اور روشنی مدھم کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قد و قامت کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بلحظہ سمٹتی جارہی ہیں دراز قد متوسط جسم ستھری و خوش وضع پوشاک سر پر سینٹ سڈول بھری بھری فرنچ کٹ ڈاڑھی سر پر بالوں کی دوپچی ٹوپی چہرہ پر اجالا آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی تیوروں میں شرافت منضبط عمر اندازیں خود اعتمادی و دل آسانی۔ بیک نظر دل نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے

ملاقات ہوئی یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی اور بھلمنساہت سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا جھکاؤ تھا مسکراتا ایسا جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسم ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ ان کا مسکرانا لب و دہن کا مسکرانا نہ تھا بلکہ چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں نے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ مولینا بولے لو ایک انسان لایا ہوں میں نے کہا شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے ملو ملو اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبّت اور رحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولینا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے پاس ہی لوٹا تھا اسے اس طور پر اٹھا لیا جیسے میرے ہاتھ اسے بیچنے والے تھے۔ مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے سنو اصغر صاحب کا ایک شعر سناتا ہوں۔ ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب بس کسر یہ رہ گئی کہ ذاکر نہیں ہیں ورنہ دیکھتے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترنم سے بیٹھے ورد سے نہیں بلکہ پھیلے سانسوں کے ترنم میں پڑھا ۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بنجائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

مولینا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ذاکر صاحب اچھے شعر سُنکر نئی اور اچھوتی دنیائیں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے۔ میں نے کہا مولینا شعر بڑے مزے کا ہے للّٰہ اسے بکس و بستر پر بیٹھکر اور لوٹا ہاتھ میں لیکر غارت نہ کیجیے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے۔ کھانا آیا مولینا نے فرمایا اصغر صاحب ذرا روحِ نشاط تو نکالیے۔ ان کو اشعار سناؤں میں نے عرض کیا مولینا ذرا چھُری تلے دم لینے دیجیے جاڑا پڑ رہا ہے انگیٹھی آتی ہے۔ کھانا کھا کر چائے کا دور ہوگا۔ پھر جھوٹ سچ ملایا جائیگا آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے ہیں۔ اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے قابل نہ عقبےٰ کے قائل! مولینا ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسے دونوں پاؤں گھٹنے سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ مولینا کے ابتہاج و اہتزاز کی خاص علامت ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں ابتہاج و اہتزاز ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی اور ضرور تامل ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں یا غیر مانوس ان کے برمحل و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو ترس گیا ابلہوں کو کون سمجھائے کہ صاحب ذوق عربی فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو آسانی سے منقح کرنے کیلئے کرتے ہیں۔ عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آئے تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش ہم کب چاہتے ہیں کہ آپ نرے احمق اور جاہل بھی ہوں اور ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے بھی دیئے جائیں۔

عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے لیکن کوئی موقع تو ایسا ملنا چاہئے جب ہم اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے کہہ گزرنے کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے پان آگئے انگیٹھی سرد ہونے لگی۔ نوکر نے کوئلے

ڈال دیئے نہ اندر سے کسی کے بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطرہ۔ نیند آئی سو گئے جی چاہا لبستر ہی پر رقص کرنے لگے۔

مولٰنا سہیل نے فرمایا اچھا اصغر صاحب روح نشاط تو نکالئے مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہے میں نے کہا مولینا ذرا ٹھہریئے ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اترا ہے مولینا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجیے، ورنہ پھندا لگنے کا اندیشہ ہے میں نے کہا رند نے ظرف تو اٹھا لیا لیکن ابھی ساغر بنانا باقی ہے۔ اس کے بعد پینے اور مے خانہ بننے کا سوال آئے گا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں متاع یوسفی مسلم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و مینخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے کہنے لگے رشید صاحب ساغر و مے خانہ کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے کلال پیدا کرتے ہیں شاعر تو شرافت و شامت کا اعلان کرتا ہے مسجد مینخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے ظرف سے کرتا ہے علی گڑھ میں ساغر و مینخانہ کی کمی کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا لیکن یہ تو بتایئے مولینا سہیل کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہنے لگے ان کی نہ پوچھئے تمام

عمرے خانہ میں رہے نکلے تو محتسب بن گئے۔ میں نے کہا محتسب ہی نہیں گواہ سرکاری بھی۔ علی گڑھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا۔ نکالے گئے ہوتے تو یقیناً رند ہوتے۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاطِ روح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا۔ کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا آپ نے نشاط روح کا مطالعہ بھی کیا۔ میں نے کہا اصغر صاحب اس وقت مولینا سہیل موجود نہیں ہیں۔ آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائے یہ شخص بلائے بے درماں ہے شعر سے لطف اٹھانے نہیں دیتا سوچنے کے چکر میں ڈال دیتا ہے وہ دیکھئے احاطہ کی پھاٹک پر کسی بزاخفش سے الجھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہوگا جو افلاطون و ارسطو سے کرنا چاہئے تھیں اصغر صاحب نے فرمایا متفرق اشعار نہ سناؤں گا پوری غزل سنئے شاعر کو اسی طرح سننا چاہئے۔ تصور سے ہم کنار ہو جیے تصویر دیکھ کر کیا کیجئے گا۔ پھر یہ غزل سنائی کیسا نرم پر تمکین و گوارا لہجہ تھا ؎

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے
جمالِ دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
اداؤ رسم بلالی و طرز بولہبی

سرشتِ عشق طلب اور حسن بے پایاں
حصول تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں	جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جامِ نگاریں کی پوچھئے ساقی	جھلک رہا ہے مرا آبِ رنگِ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے لکھنو میڈیکل ہسپتال میں مدتوں صاحبِ فراش رہا اس زمانہ میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے۔ تقریباً ہر اتوار کو میں ہسپتال کے بالاخانہ پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو پاؤں کی ایک خاص آہٹ سنتا۔ دروازہ کھلتا اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ کر یا محسوس کر کے خوش ہو رہے ہیں سلام علیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے جیسے کوئی خوشخبری سنا رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لئے کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لئے آئے تھے۔ میری طرف بھی آ نکلے۔ باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دور دور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون شیطان کی آنت شائع ہوا تھا میں نے ایک بار پوچھا اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں اور زحمت و زیر باری اٹھاتے ہیں کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولے شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے

میں نے کہا فرشتوں کو بھی! فرمایا فرشتہ کو شیطان ہو جاتے بھی تو آپ نے
سنا ہوگا! میں نے کہا اصغر صاحب تکلیف نہ ہو تو کچھ سنائیے اصغر صاحب
میری اس دعا غالباً غیر متوقع فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی
غزل بڑے لطف سے سنائی ؎

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ — اڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بتخانہ
یہ دین وہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بت خانہ — اک اور قدم بڑھ کر اے ہمت مردانہ
قربان ترے میکش ہاں اے نگہ ساقی — تو صورت مستی ہے تو معنی میخانہ
اب تک نہیں دیکھا ہے کیا اس رخ خنداں کو — اک تار شعاعی سے الجھا ہے جو پروانہ
مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمی حسن شمع — اس سے بھی زیادہ ہے سوز غم پروانہ
زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحیر ہے — صد رشک طریقت ہے یہ لغزش مستانہ
اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا — یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ
انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے — اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے بلکہ یوں
ہی باہر جا رہے ہیں۔ جب میں صحت یاب ہو کر واپس آگیا تو ایک عرصہ کے بعد
معلوم نہیں کس سلسلہ میں میں نے پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں
مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری رہتی تھی میں نے آپ کو اخلاقاً
بھی کبھی فکر مند نہ پایا کیا میری ہمت افزائی مقصود تھی۔ بولے بالکل نہیں اچھا

سنئے ایک لطیفہ سُناتا ہوں۔

ایک دن میں ہندوستانی اکیڈمی سے مکان واپس آرہا تھا...... صاحب راستہ میں ملے اور نہایت غمناک لہجہ میں بولے اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا انتقال ہوگیا ایسے تھے ویسے تھے میں سن کر ہنس پڑا اور بولا حضرت حواس کی باتیں کیجئے انتقال کرنا کیسا میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہوکر رہیں گے۔ انھوں نے مجھے باختہ حواس یا بے وقوف سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے گنانے میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں "حیات" لکھی ہوئی ہے وہ نہ مانے میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آیئے تار دے کر دریافت کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خبر غلط نکلی۔ رشید صاحب واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچکر آپ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے اور میں مسرور و مطمئن ہوجاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا، انھیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے وہ کچھ عالم متبحر نہ تھے لیکن اردو کے

بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے۔ بڑی رسا
طبیعت تھی۔ نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک اس
سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے اُن کا
یہ سابقہ پہلی ہی بار پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فنِ
تنقید کے جدید ترین اصول سے آشنا تھے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے
مشیر ادبی کی حیثیت سے ان امور سے سابقہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت
متوازن متین و بے لوث تنقیدیں نکلیں اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل
کا دھوکا ہوتا۔ پکے مسلمان اور مشرقی تھے لیکن میں نے بڑے بڑے مغربیت مآبوں
کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا۔ اُردو میں عام
نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور، رنگینی اور وزن پیدا کرنے کیلئے
حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اُردو کے اکثر مستند اہلِ قلم بھی الف لیلہ
کے بکبارہ سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہوگی کہ اُسے نہ بھی کہیں تو ہرج
نہیں، لکھیں گے اس طرح جیسے دونوں کا اشتہار لکھ رہے ہیں "ہندو مارے
ڈالتا ہے" یا "محبوبہ بھاگ گئی ہے"، مرحوم تحریر و تقریر دونوں میں حفظِ مراتب
ملحوظ رکھتے تھے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر انھوں نے تحفوں کا ایک
سلسلہ بچّوں کے لئے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچّوں
کو بڑے دل نشین انداز سے روشناس کرایا ہے کچھ دنوں لاہور کے

ادبی مرکز میں بھی علمی خدمات انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف "اردو کی ذہنی تاریخ" شروع کی تھی کئی سو صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈمڈ ہو گئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے ان کو کبھی تنگدستی کا شاکی نہ پایا۔ اچھا خرچ تھا۔ اچھا پہنتے تھے اس سے اچھا کھاتے تھے اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔ اُن سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے اُن جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ اُن کے جسم پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہو سکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجہ کے بدل پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی ہر چیز میں ذوق سلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔ آج تک میلے اور پیوند لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے گفتگو میں رکیک یا سخیف فقرے زبان سے نہ نکالتے گفتگو آہستہ کرتے مسکرا کر کرتے لہجہ ہمیشہ نرم ہو وقار یا شگفتہ ہوتا۔ میں نے اُن کو کبھی مایوس مضمحل یا مضطرب نہ پایا۔ اُن کے ملنے والے مختلف یا متضاد مشرب کے لوگ بھی تھے لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی اور دوسرا بھی

مایوس یا منغض نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل انھوں نے کٹرہ میں ایک مکان دو کانوں کے ذیل میں لب سڑک لے لیا تھا بیٹھک میں برّاق چاندنی کا فرش تین چار گاؤ تکیے الماریوں پر روغن دیوار پر قلعی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا' کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں البتہ ذرا شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان ہے یا حکیم اجمل خاں کا مطب۔ خدا کے لیے اس جگہ کو چھوڑ دیئے لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں۔ گھوڑے پر چوکا لگانے سے فائدہ ؟ مجھے تعجب ہے آس پاس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک حملہ کیوں نہیں کر دیا۔ اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہومیوپیتھک دواؤں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجئے اصغر صاحب ہنس پڑے فرمایا آپ نے بات ٹھیک کہی مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو یک نظر یہ صفائی خود مجھے کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اسے فوراً خریدتے دوستوں کو دکھائی جاتی۔ کوئی پسند کر لیتا تو اسی کے نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مرادآباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے سینی دکھائی پوچھا کہئے کیسی ہے میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ "فتوحات" میں سے ہے یا خریدی ہے ؟ بولے جی نہیں فتوحات کا یہاں کہاں گزر ہیں نہ ملّا نہ انگریز خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے

میں نے پوچھا کیا قیمت دی؟ کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے سُنا نہیں۔ ع

جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آجاتی ہے تو اسے منجوا تا ہوں اسی میں کھانا منگا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں نقوش دھندلے ہو گئے ہیں میں حافظ کا کچا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جانے والے جانتے ہیں بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے زمانے کے سیمیائی پردوں پر رنگ و آہنگ خدوخال رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے حزیں و حسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں!

اصغر صاحب کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے۔ مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا حملہ سہنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں مشکل سے ہموار پڑتے آخر آخر میں الہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلویڈیر کے احاطہ میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا مکان کے احاطہ کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہنچنے کا

وقت متعین تھا۔ میں نے ہمیشہ انتظار میں انھیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے پایا۔ اس میں کبھی فرق نہ آیا پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا پھنسی آستینوں کا کرتا۔ سر پر سپید ٹوپی ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ بٹوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سگرٹوں کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے قدم سنبھالتے ٹہلتے ہوئے مجھے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہائے اُن کا باغ باغ ہونا: زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اُترتی معلوم ہوتی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے اُن کی باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں کہتے رشید صاحب سُنا جب سے بیمار ہوا ہوں ذرا عیّاش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے پان تمبا کو فراہم رکھتا ہوں یہ دیکھیے ہر مارکہ کا سگریٹ ہے۔ ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص احباب کی صحبتوں میں آتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہنچتے۔ نوکر کو آواز دیتے ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجیے میں نے ہارلکس مالٹڈ ملک شروع کر دیا ہے یہ اوولٹین کا گلاس ہے یہ فورس ہے اور ہاں آپ نے کیونڈر کے مکھن کھائے ہیں ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمائیے غرض ہر چیز بڑے

شوق و لطف سے پیش کرتے پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی حاضر کیا جائیگا۔ مدتوں سے بانگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج اُسے آپ دسترخوان پر چاروں شانے چت پائیں گے۔ یہ مرغ مسلم کا عنوان تھا۔

اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ برقی قوام ہے وہ زعفرانی پتی ہے اور ہاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم.... صاحب نے دی ہیں کہتے تھے اُن کے مورثِ اعلیٰ نے شاہان اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا اس کا نام آبروئے اودھ ہے اسے ضرور چکھئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا کہنے لگے لیتے جایئے جس کی آبرو خطرہ میں دیکھئے گا دے دیجئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطفِ بیان میرے لئے تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انہی کو المضاعف کرکے اور خود اوڑھ کر پیش کر رہے تھے اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے اُن کی اس حکمتِ عملی کو فاش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اُس کا ایک ٹوکرا ساتھ کر دیتے اور دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجنے تھے معلوم ہوا کہ وہ آجکل موجود نہیں ہیں زیادہ تو میں نے رکھ لئے اور کچھ آپ لیتے جایئے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی۔

تھوڑے انھیں بھی بھیج دیجیۓ گا۔

ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آ رہے تھے راستہ میں چند گھنٹوں کے لیۓ الہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے میرا سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا مرحوم کو بچہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لئے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھکر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کر دی تھی ہفتوں بعد چارپائی سے اٹھے تھے اسلئے بہت نحیف ہو گئے تھے۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا اور نوکر نے مانگا لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اُتارا۔ تھوڑی دیر بعد بچہ کو گود ہی میں لئے واپس ہوئے شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے حتّیٰ کہ دودھ پینے کیلئے ماں تک جانے نہ دیا۔

کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آپنے کیا کیا تھا بولے رشید صاحب آپ تو دیکھ چکے ہو دوست کا بچہ اکتنا خوبصورت معصوم اور پیارا بچہ ہے آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچوں سے مجھے کتنی الفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپکے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اُسے دیکھکر

میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ اول تو میں بھول گیا کہ بیمار و نحیف ہوں دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز پندار پیدا ہوا کہ احمد بتو سے کہیں زیادہ دلکش اور پیارا ہے۔ ذرا میری یادکواسی تو دیکھئے میں نے بتو کے والدین سے بھی کہہ دیا کہ احمد نے بتو کو زیر کر دیا۔ چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات سے واپس آیا۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کر دی ایک بار خط آیا لکھا تھا "بلڈ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہے ہیں دیکھئے کیا انجام ہو"

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے جب کبھی الہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگائے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرتے مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے مالک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی معاً اصغر صاحب نے اسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہہ دیا اصغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجہ کے ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ آپ چپ کیسے ہو گئے کہنے لگے کیا کہوں ان گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سنا تھا۔ گلابوں کے بارہ میں تو آپ

نے فیصلہ کر دیا۔ نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھیے کمبخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا..... صاحب (الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی) کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے۔ الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیونکر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بدعادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا مرحوم کی آخری علالت کے زمانہ میں میرا جانا الہ آباد ہوا صبح پہنچا شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہوگا صبح چلے جائیے گا میں ایسا بدبخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

مجھے کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ میرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر تشنج پڑ گئی لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت

بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔ اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔

دو ہی ایک روز کے اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا۔ بلوپڈیر کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برفشانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے کچھ اور نہ تھا اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا سب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے یا برے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں بے نشان و گمان معلوم نہیں کیوں

اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دیں گے اور لکھو بہتر لکھو اور جلد لکھو کی اُمنگ پیدا ہوتی اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارہ میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحب فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے میرا یہاں مطلب صرف اس شیفتگی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصورات سے مرحوم کو تھی اور جن کا خفیف سے خفیف ارتعاش بھی اُن کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہو جاتا۔

فالج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کردی تھیں جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کرلی تھیں خون کا دباؤ

بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گر ہیں زندہ رہنے میں ارادہ کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مرونگا نہیں۔ البتہ بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نپٹ لیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید حملہ اور یک لخت حملہ ہوا اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہ کر ہمیشگی میں مل گئے۔

اصغر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں لیکن انھوں نے خودداری اور بانکپن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا اتفاقی تھا۔ وہ کچھ ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ اوباش، قلندر، اربابِ علم و فکر، صاحبِ باطن، اربابِ دول، بکواسی و بے بہرہ طالب علم، کاروباری لوگ۔ میں نے ہر ایک کو ان کا قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنھوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔

اصغر صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ جن کی قابلیت اور شخصیت مسلّم ہے وہ بھی اصغر صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں یا فاتحوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہیے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ خود ان کی اُلفت و اخلاص کی منزلت کو عزیز رکھتے تھے۔

ان میں ایک خاص نوعیت کی بڑائی تھی جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا! جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی۔ اصغر صاحب کی باری آئی مرحوم کی آواز طبعاً پست تھی شعر پڑھنے شروع کیے تو مجمع میں انتشار پیدا ہوا مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لیکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنانے شروع کر دیئے ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

زِلا تسخیر کردم ایں جہانِ مہر و انجم را
ز جوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کس راز کی غمازی کر رہا تھا۔ اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علی گڑھ کی آبرو رکھ لی اور جامعہ کو جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعروں سے بیزار تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں

کی دعوت رد کرنا گناہ ہے ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ ہم میں نظر و فکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سفینہ نو کی متحمل ہو سکے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے کڑھتے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کر لو آنا تم کو یہیں پڑے گا۔ جگر صاحب ایسے غیور عزت پسند قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پرانے زمانہ میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے باایں ہمہ جگر صاحب ایسا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں اپنی اس افتادِ طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے عالمِ ہوش میں ہیں اور پچھلی عادت یک قلم ترک کر دی ہے میں نے ان کو انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں دیکھا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا۔ لیکن اصغر صاحب کا نام آتے ہی ان کو یا تو سناٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشکبار پایا۔ اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش

کرتے ہیں اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم کی نظر سے یہ سارے مضامین گزرتے تھے لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو برا بھلا کہتے نہ سنا اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار ہوں۔ خدا کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے یہ کڑیاں اٹھ جائیں تو دنیا اختلال محض ہو کر رہ جائے ایک دفعہ انھوں نے فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتادِ طبع کا احتساب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے حالانکہ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ برے غزل گویوں نے کیا خرابیاں پھیلائیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اچھے غزل گو کتنی خوبیاں پیدا کر سکتے ہیں اور پھیلا سکتے ہیں۔

مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو مدنظر رکھ کر شعر نہیں کہتا ہوں کیا کروں کہ بلند گھر سے نازک اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں کاش میرے خیالات و احساسات کوئی دوسرا پیکر اختیار کر لیتے۔

مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں!

ایک دفعہ میں نے عرض کیا اصغر صاحب آپ تو جتنے اور جیسے شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اوّل درجے کے اشعار تو رہنے دیا کیجئے بقیہ کو حذف کر دیا کیجئے۔ اصغر صاحب پر ایک جھرجھری سی طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا رشید صاحب یہ آپ نے کیا بات کہی؟ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاعر کبھی دوسرے درجہ کی بات کہتا ہے؟ کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اوّل ہی درجہ کے شعر کہتا ہے سننے والے کے نزدیک وہ اول درجہ کا ہو یا دوم درجہ کا۔ اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اُسے کہہ دیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ بہت بڑی کچھ دن اور گزریں تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

اصغر صاحب کو سجاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے۔ فرمایا ہم میں ایسے نقّاد اور مفکر کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے جن کا تدارک نہ کیا جائے تو ہونہاروں پر زندگی تنگ ہو جائے۔ سجاد بڑے بت شکن تھے کچھ دن اور جیے ہوتے تو کیا معلوم توفیق الٰہی انھیں ابراہیم بنا دیتی۔

سر تیج کا بڑا احترام کرتے تھے کہتے تھے سر تیج کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک

دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی کو اس کی حدود سے گزرتے دینگے اردو ہندی کے سلسلہ میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر تیج اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اردو سے بر بنائے اردو الفت ہے دونوں میں پرانے زمانہ کے مسلمان شرفا جیسی وضع داری ملتی ہے۔ ایک بار ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو آئی تو فرمایا ہندوستان میں سر تیج ہی ایسے شخص ہیں جو جماعتی تعصب سے بلند ہیں ہندوستان ایسے ملک کے لئے سر تیج ہی جیسے سردار کی ضرورت ہے جب تک ہم ہندوستان کو ہندو مسلم روایات رواداری اور خوش حالی کی علامت نہیں بلکہ ان کی ملکیت سمجھیں گے۔ ہندو مسلم ہرگز متحد نہ ہوں گے۔ سر تیج اور دوسرے بے شمار لیڈروں میں یہی فرق ہے۔

اونچی جماعتوں کے مختلف الخیال طلبا اکثر اُن کی صحبت میں دیکھے گئے تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ میں نے مرحوم سے ایک دفعہ اس کی وجہ پوچھی بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں ہر علم کے تار و پود ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف معلول سے ہوتی ہے پھر آپ تو جانتے ہیں کتابی اور اختیاری علم (مسکرا کر) بزرگوں کے [illegible] کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔ چنانچہ علم از زبان اور

معلم نایاب ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں کیے جا سکتے!

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا محل نہیں۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجیے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجیے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہے بلکہ جمال و کمال کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جسے ان کا کلام بروے کار لاتا ہے ان کا کلام انھیں کی طرح محبت کرنے والا رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے، اصغر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے تفکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

اس سلسلہ میں محض افہام تفہیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجیے۔ حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ

دینی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہو لیں گے اقبال آپ کو سرِ مو اِدھر اُدھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال کے ہاں تصورات جمیل اور دعوت دید۔ اقبال حکومت کرتے ہیں اصغر رفاقت کرتے ہیں معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے در و بست کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی ہی سلیقہ شرافت اور صداقت میں گزری۔ ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہوگا۔ اصغر سرتاسر غزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلّمہ عریانی یا خامکاری نہ ملے گی آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں ان کی رنگینیاں اور ان کی ذمہ داریاں۔ ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے۔ کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو

الفاظ ومعنی کیف وکم، رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خد و خال نظر آتا ہے۔ عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ تھوڑے بہت لکھے پڑھے بھلے مانسوں میں بیٹھے اور ذوقِ بصیرت رکھتے ہوں شاعری نہیں دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے۔ اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے۔ قصور اُس مقصد اور معیار کا ہے جس کے اصغر واضع نہ مقلّد نہ مدّاح!

اصغر صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں گے!

تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی!

محمد ایوب عباسی مرحوم کے بارے میں کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں! وہ اتنے اچھے تھے۔ اتنے ارزاں تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ نہیں وہ یہاں سے نہیں وہاں سے۔ ابھی نہیں آگے چل کر۔ یوں نہیں ووں۔

وہ موجود تھے تو ان کی مثال نعائمِ فطرت کی تھی مثلاً ہوا یا پانی۔ روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی لیکن ان میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آجائے تو پھر دیکھیے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی ناقابلِ التفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوب ایسے ہی تھے۔ وہ دوستوں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھل مل گئے تھے کہ ہم سب کو ان کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا لیکن جب وہ ہم سے رخصت ہو گئے تو ہم میں سے ہر ایک نے یہ محسوس

کیا کہ جو چیز ناقابلِ التفات حد تک ارزاں و عام تھی وہی ناقابلِ بیان حد تک اچھی، ضروری اور نایاب تھی۔

ہم سب کی زندگیوں میں مرحوم کے گھل مل جانے کا راز یہ تھا کہ ان میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے۔ دولت مند نہ تھے۔ کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انھیں توڑ جوڑ آتا تھا۔ نہ خوش پوشاک نہ خوش گفتار۔ نہ خوش باش۔ نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں اور نہ اب ڈھونڈھے سے بھی کوئی ایسا ملے!

سیاہ فام چیچک رو پست قد نحیف الجثہ پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ پھیر لے۔ برتے تو غلام بن جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ایوب کی خوبیوں نے ان کی بدہیئتی کو کس درجہ دل آویز بنا دیا تھا۔ فطرت اپنی چوک کی بسا اوقات کیسی بے دریغ بخشش سے تلافی کرتی ہے۔ میری ہی نہیں میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی اُن سے بڑی پرانی ملاقات چلی آتی تھی۔ اور میں نہیں بتا سکتا کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر دخیل تھے اور ان کی موت نے ہم سب کو کیسا بے قرار و مایوس اور کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے اور ایک بڑے مستند، شریف، ذی علم اور صاحبِ خیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر میں تھا جب ایوب

فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی ہو کر پہ دوسٹ آفس میں ملازمت کرلی۔ اور علی گڑھ ہی میں رہ بس گئے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں و خوردوں کے ہم سبق تھے علی گڑھ آئے تو ہم سب ایک ہو گئے۔ اور ستر اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ یہ تو تھے میرے ذاتی تعلقات۔ اسی قسم اور اسی درجہ کے تعلقات مرحوم کے اوروں سے بھی تھے۔ اور سب جانتے ہیں کہ ان کی جدائی کا جو الم مجھے ہے اس سے کم دوسروں کو نہیں ہے! خدا ہی بہتر جانتا ہے اس پیکر حقیر میں دلسوزی و خودسپاری کا کیسا بیکراں و بیش قیمت خزانہ و دیعت تھا!

مجھ پر میرے بچوں پر میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے۔ خوشی کی بات ہو تو ایوب صاحب سب سے پہلے موجود اور سب سے زیادہ خوش۔ رنج و تردد کا موقع ہو تو سب سے پہلے حاضر، بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یا ہر شخص کی خوشامد کر رہے ہیں۔ خوشی میں ہر طرح کے جملے فقرے سر کر رہے ہیں اور اپنی مسرت کا طرح طرح سے اظہار کر رہے ہیں۔ رنج و مایوسی کا موقع ہو تو ایک حرف زبان پر نہیں۔ نہ تسکین کا نہ تقویت کا چپ چاپ بیٹھے سراپا کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یا محبت و ہمدردی سے بے اختیار ہو ہو کر منہ تک لیے

ہیں۔ ذرا بھی احتمال ہوا کہ کسی کا آنا یا کسی معاملہ میں میرا دخل میرے لئے تکلیف دہ ہوگا۔ تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح اس کا سدِّ باب کر دینا اور اس طرح کرنا کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہو۔

میرا اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ ہو اور ایوب سب کام کر دیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی تمام تر ذمہ داری ہم پر ہوتی تھی لیکن اُس سے بذاتِ خود عہدہ برآ ہونے کے بجائے یا اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایوب صاحب ہی پر بگڑتے تھے اور بہانے نکال نکال کر انھیں سخت سست کہتے تھے۔ ایوب صاحب معمولی ملگجی شیروانی پہنے۔ ٹوٹا پھوٹا جوتا۔ میلا سا مفلر گلے میں لپیٹے جلدی جلدی چلے آرہے ہیں۔ ہائے ان کا وہ چھوٹا سا قد۔ مشکل سے پانچ فٹ کا مشغول و منہمک مفلر جلد جلد کھولتے لپیٹتے راستہ میں ہر ایک سے کچھ کہتے کچھ سنتے گرتے پڑتے چلے آرہے ہیں۔ ابھی فاصلہ ہی پر ہیں کہ جس شخص کے پاس آرہے ہیں اس نے صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ آپہنچے تو سخت سست کی بوچھار ایوب صاحب ہیں کہ نادم ہیں۔ ہنستے جا رہے ہیں۔ معذرت کر رہے ہیں۔ دو چار صلواتیں خود بھی سنا دیں۔ غرض دو چار منٹ کے بعد اطمینان ہوا تو ٹھکانے کی باتیں ہونے لگیں۔ وعدہ کیا کہ کام کر دیں گے نہ کریں تو جو چاہے کر ڈالئے چلنے لگے تو پھر کام کی تاکید کی گئی۔ پانچ سات

صلواتیں سنادی گئیں اور اتنی ہی سُن لی گئیں

ایوب صاحب کا گھر بارہ مہینے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بنا رہتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اعزا اور دوستوں کے لڑکے مجھے یقین ہے اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایوب صاحب کے گھر میں قیام کرکے اُن کے خرچ سے اُن کی توجہ و محنت سے اور ان کے بل پر اعزا اور احباب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہو گی۔ اتنا اب تک کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوا اور نہ شاید آئندہ ہو۔

ان کے گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا تھا۔ ہر شخص کو کھلانا پلانا سامان دینا۔ ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا اور ان کی فکر کرنا۔ اس کے بعد آفس کا کام دوستوں کا کام غرض اس شخص کی مشغولیتیں دیکھ کر ہم سب تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ کیسے ہے اور اس کے حواس کیونکر بجا ہیں۔

اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ ایوب صاحب نے شاید ہی کبھی اپنے گھر کھانا کھایا ہو۔ یا دو روز مسلسل اپنے گھر سوئے ہوں جہاں مل گیا وہیں کھا لیا اور ہو سکا تو وہیں رات بھر کے لئے پڑ رہے چارپائی بستر میسر آئے یا نہ آئے آرام کرسی پر سو رہے۔ میز پر لیٹ گئے ورنہ کچھ لپیٹ کر فرش پر ہی ایک طرف سکڑ سکڑا کر رات بسر کر دی مشکل سے ایک آدھ چپاتی اور تھوڑا

سا سالن کھاتے تھے ۔ اتنا کم کھانے والا بھی شاید ہی کہیں ملے کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔

سگرٹ اور حقہ کے زیادہ شائق تھے ۔ بیڑی ۔ سگرٹ، سگار، حقہ جو مل جائے ان کیلئے کفایت کرتا تھا ۔ دوستوں میں سے کوئی بیمار پڑا اور یہ آموجود ہوئے ۔ رات دن کا مسلسل قیام پاؤں دبا رہے ہیں سر میں تیل ڈال رہے ہیں، دوا لا رہے ہیں کھانا تیار کر رہے ہیں اور بقول ہم پورب والوں کے اس کا گو موت کر رہے ہیں ۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہہ رہے ہیں ۔ بیمار اچھا ہوا تو شکریہ میں بھی سخت سست ہی کلمات کہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ خوش ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ ایوب صاحب کو جو لوگ صلواتیں سناتے تھے وہ سب ایوب صاحب کے گرویدہ احسان ہو کر شعرا اور بے فکروں نے لطف و تشکر کے جتنے الفاظ وضع کیے ہیں ۔ وہ سب اُن گالیوں کے سامنے ہیچ تھے جو ہم سب ایوب کو دیتے تھے اور ان سے سنتے تھے!

ایک دفعہ بیوی بچے مکان گئے ہیں اور دو بچیاں رہ گئیں، باورچی یک بیک چلا گیا ۔ برسات کا موسم تھا میں دن بھر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا تھا ۔ کوئی ۵ بجے شام گھر واپس ہوا ۔ دیکھا تو ہر چیز قرینہ سے مکان میں لگی ہوئی ہے ۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں ۔ ذرا ہی دیر میں ایوب صاحب آنکھ ملتے ۔ راکھ میں لت پت

باورچی خانہ سے ڈانٹ کر بولے: جی گلچھرے اُڑائیے۔ لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں چولھا ٹوٹا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیا ہوا کچھ سخت و سست الفاظ کے بعد آخر ڈائننگ ہال کو کیا ہوا تھا۔ وہیں سے انتظام کر لیا ہوتا۔ بولے۔ جی شام کے ۵ - ۶ بجے آپ کے لئے ڈائننگ ہال سے پاتر خانیاں نہ آجاتیں۔ بچیاں کیا کرتیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آفس سے براہِ راست شہر گئے وہاں سے بچیوں کے لئے آم اور پکانے کے لئے کچھ ساگ ترکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں پل پڑے ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے اُلجھے ہوئے تھے میں نے کہا بھئی ایوب خدا کیلئے کچھ تو ٹھکانے کی چیز کھا پی لیا کرو ورنہ آنکھیں بھیک مانگنے لگیں گی۔ بولے جناب نے بھی تو منجن ہی کھا کھا کر عینک کے نمبر بڑھا لئے ہیں۔

کھانا پینا ہو چکا تو آم نکالے میرے سامنے تو قلمی اور لنگڑے رکھے اور خود چوسنے والے آم لئے میں نے کہا یہ آم کیوں نہیں لیتے۔ کہنے لگے یہ آپ ہی کو مبارک ہوں۔ مجھے تو چوسنے والے ہی پسند ہیں۔ میں نے کہا چوسنے والے اپنے گھر کھائیے گا۔ میرے ہاں اس قسم کی قومی حرکت کروگے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔ کھانا پینا ختم ہوا تو اپنی کھرّی چارپائی بچیوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ رہے اور اُن سے انھیں کی دلچسپی کی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب وہ سو گئیں تو سر سے پاؤں تک کمل تان کر خاموش ہو گئے میں نے دیکھا تو کہا۔ ایوب تم اس گھر سے نکلو۔ اس سڑی گرمی میں کمل اوڑھکر

برآمدہ میں سوئے تو ظاہر ہے تمام رات میں صحن کے اس چبوترہ پر رقص کرنا لگا
کیا فائدہ صبح میں پاگل خانہ پہنچا یا جاؤں اور تم قبرستان ۔ نہ مانے اور
اسی طرح سوئے ان کا یہی معمول تھا۔

صبح جیتے جاگتے اُٹھ بیٹھے اور روں کے دھندے میں لگ گئے علی گڑھ
میں داخلہ کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے ۔ سارے بزرگانِ قوم جو سال بھر
ہم سب کو گالی اور اخبارات کو پیام دیتے رہتے ہیں ۔ نئے سیشن کے شروع ہوتے
ہی ہم کو قرونِ اولیٰ کا مسلمان قرار دیدیتے ہیں ۔ پہلے خطوط آنے شروع ہونگے
اس کے بعد تار اس کے بعد تانگے " خلاصہ فریاد " ایک ہی ہوتی ہے ۔ یعنی لڑکا
آپ کا ہے ۔ یونیورسٹی قوم کی ہے اور حکومت ہندوؤں کی ۔ لڑکے کو داخل
کرلیئے ۔ جتنی مراعات ہوسکیں دلوایئے ۔ بقیہ خود پوری کیجئے ۔ چال چلن اور
خواندگی کی نگرانی کیجئے ۔ پاس کرایئے ۔ نوکری دلوایئے ۔ اور ہم دونوں کو اسوقت
تک مہمان رکھئے جب تک کہ لڑکا یہاں کے ماحول سے آشنا اور خود اُن سے
متنفر نہ ہوجائے ! حج اور تیرتھ کے بارہ میں تو یہ طریقہ ہے کہ ملکوں کے مختلف
حلقے مطوف اور پنڈوں نے بانٹ لئے ہیں ۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ
آپ کی جان و مال کے ذمہ دار اخدائی فوجدار ہیں ۔ جان کے کم مال کے زیادہ
علی گڑھ کا دستور اس سے بالکل مختلف ہے جس کا جی چاہے جس جس مطوف یا پنڈے
کے یہاں ٹھہر جائے ۔ اور اس کی جان مال و ناموس کا لا[illegible] ۔

داخلہ کا زمانہ عین برسات کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے برسات میں شکم پروری اور قوم کی مرثیہ خوانی کا بیک وقت زور ہو اور کام کوئی نہ ہو تو معدہ کب تک ساتھ دیگا۔ والدینؔ میں سے کوئی ہیضہ میں مبتلا ہے۔ کوئی اسہال میں کسی کو یونانی علاج موافق نہیں آتا۔ کسی کو ڈاکٹری دوا سے اصولاً اختلاف ہے۔ کھانا ناشتہ سب کو موافق حکیم صاحب کے ہاں لے جائیے یا انھیں بلائیے تو بتائیں گے موجودہ تکالیف اور علاج کرائیں گے دیرینہ ناگفتہ بہ شکایات کا! اس زمانہ میں اور ایسے مواقع پر ابوّاب مرحوم کام آتے تھے۔ کسی کے

لہ یہ لفظ لغوی معنوں میں نہیں استعمال ہوا ہے۔ یہ علی گڑھ میں ترک موالات کے زمانہ کی یادگار ہے۔ جب ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو سمجھانے سنبھالنے علی گڑھ آیا تھا اس زمانہ میں طرح طرح کے بزرگوں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ لوگ گھبرا گئے تھے۔ چنانچہ اب جب لڑکے کے ساتھ کسی غیر معمولی لیکن چالیس سال سے زائد عمر کے بزرگ کو کوئی دیکھ لیتا ہے فوراً کہہ پڑتا ہے "فھوالوالدین" یہاں تک کہ اگر کسی لڑکے کے ساتھ گھر کا کوئی پرانا نوکر بھی آئے تو لوگ کہیں گے فلاں صاحب کے ساتھ "ایک والدین" بھی ہے! ایک والدین کا فقرہ علی گڑھ میں قطعاً موزوں سمجھا جاتا ہے مثلاً میں فلاں جگہ جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک والدین ملے۔ چنانچہ علی گڑھ کی لغت میں والدین کے معنی خواہ مخواہ ماں باپ کے نہیں ہیں بلکہ کوئی بزرگ نما صورت کا اجنبی جو کسی طالب علم سے وابستہ نظر آجائے۔ والدین ہے۔

لئے چارپائی کی ضرورت ہے۔ تو وہ لا رہے ہیں۔ کسی کے پاس سارٹیفکٹ نہیں ہے اس کی سبیل نکال رہے ہیں۔ کسی کو مخصوص بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں مل رہی ہے تو اس کے لئے دوڑدھوپ کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس روپے نہیں ہیں تو ادائگی بالاقساط کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس کتاب یا فرنیچر نہیں ہے تو اس کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کوئی اسٹریچی ہال کے محشرستان میں کھو گیا ہے تو اسے راستہ پر لگا رہے ہیں۔ والدین یا سرپرستوں کے لئے حقّہ یا پرانے اُردو ناولوں کی ضرورت ہے تو اسے فراہم کر رہے ہیں۔

اور سب کچھ ہو گیا تو اشارہ کنایہ سے حیلہ حوالہ سے۔ خوشامد کر کے رو پیٹ کر جھنجھلا کر آمادہ قتل یا خودکشی ہو کر مہمان کو میزبان کا گھر چھوڑنے اور اپنے اپنے ٹھکانے پہنچنے کا مرحلہ طے کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی جگہ نہیں ہو رہا ہے میرے گھر آپ کے گھر دوستوں کے گھر اور خدا جانے اور کہاں کہاں یہی ڈراما ہو رہا ہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ اپنے فرائض اور اپنی مصیبتوں کو نظرانداز کر کے دوستوں اور دوسروں کی مصیبت میں شریک ہیں۔ میزبان مہمانوں سے تو کچھ بولتا نہیں لیکن آخر غم و غصہ نکالنے کا کوئی موقع تو ہو اس کے لئے ایوب صاحب تھے۔ انھیں بلایا گیا۔ یہ پہنچے تو کچھ متردد ہوئے کچھ نادم اور کبھی تالی بجا کر قہقہہ لگانے لگے پھر بولے "معلوم ہوتا ہے کوئی اور آیا یا کسی اور کو دست آئے۔ رشید صاحب! واللہ خوب ہوا بڑا مزا آ رہا ہے اور لکھیے

مزاحیہ مضمون[1]

ایوب مرحوم کو برج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن کی زندگی میں اور کچھ انہی کی وجہ سے ہم لوگ بھی اس کے بڑے شائق ہو گئے تھے بازی نہیں لگائی جاتی تھی اس لئے کہ ہم میں ایک سے ایک اناڑی کھیلنے والا تھا جتنا کھیلتے اُتنا ہی کھیل میں تنزل کرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو خواہ وہ جیتے یا ہارے سخت سست اتنا کہہ لیتے تھے کہ کسی اور بدل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی اس زمانہ میں ہریجن کا لفظ اخبارات میں آیا تھا۔ بے تکلف صحبتوں میں ایوب مرحوم کا یہی نام رکھ دیا گیا تھا۔ مرحوم بھی کچھ کم نہ تھے ہم سب کو بھی ایسے ایسے ناموں سے پکارتے تھے کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ ان کے بغیر تاش کی صحبتیں بالکل بے کیف ہوتی تھیں۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ ایوب مرحوم کھیل میں موجود نہ ہوئے تھوڑی ہی دیر میں سب نے تاش پھینک دیئے کہ بغیر ہریجن کے کوئی لطف نہیں

---

[1] ایک دن میں اور ایوب مرحوم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی بزرگ ملنے آئے شکل سے کچھ قومی کچھ علمی اور تھوڑے بہت سراپا فتنہ معلوم ہوتے تھے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے حرفِ مطلب زبان پر لائے یہ بھی ہو لیا تو اور باتیں شروع کر دیں۔ بالآخر رخصت ہونے لگے تو بولے رشید صاحب آپ جیسا مزاحیہ مضمون لکھنے والا کوئی اور نہیں! ایوب صاحب اٹھ کر کمرہ میں بھاگ گئے اور دیر تک بر آمد ہوئے ہنستے ہنستے لوٹے جاتے تھے اور بار بار کہتے تھے اور لکھئے مزاحیہ مضمون!!

رات زیادہ گزر چکی ہے، ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں کی موٹر پر ہم سب ان کی تلاش میں نکلے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کسی دوست کے ہاں ملے۔ اپنے گھر چونکہ رہتے ہی نہ تھے۔ اس لئے وہاں ہم سب کبھی نہ گئے۔ دوست کے ہاں بھی رونقِ محفل وہی تھے۔ اس لئے وہ لوگ بھی مارنے مرنے پر تیار ہوئے کہ ایوب کو جانے نہ دیں گے۔ بڑی بڑی خوشامدوں سے یا جھگڑ کر انھیں لائے اور محفل پھر سے جمی۔

تاش کے شائق اتنے تھے، لیکن براہ راست کبھی نہیں کہتے تھے کہ چلئے تاش کھیلا جائے۔ آئے اور بیٹھ گئے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں، میں خوب سمجھتا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ اس لئے عمداً غیر متعلق باتیں چھیڑتا رہا یہ برابر وار خالی دیتے رہے۔ آخر کار میں نے کہا: ایوب تم کو تو تاش کا ہیضہ ہے، نہایت سنجیدگی سے بولے: جی ہاں آپ لوگوں کو شاید چھینک بھی نہیں آتی۔

میں تیار ہوا، دونوں ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے۔ ہم خوب سمجھے تھے کہ وہاں کیا پیش آئے گا۔ ایوب مرحوم کو دیکھتے ہی للکارا: ہرگز دروازہ کے اندر قدم نہ رکھنا" مرحوم بولے: بس بس ڈاکٹر صاحب بہت زور نہ باندھیے دروازے کے اندر خود تو کبھی قدم باہر نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی اور بھبکی یہ! دیکھیے (اتنے میں ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں بھی آ گئے تھے) اعزہ زین شہر

تشریف لائے ہیں"۔ اصغر صاحب بولے "لعنت ہے معززین شہر پر اور آپ پر بھی" اسی سانس میں نوکر کو آواز دی "میز بچھاؤ، پاندان لے چلو" ایوب مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے: "کیوں جی باورچی تلاش کیا؟" مرحوم بولے، "بھیجا تو تھا آپ کو ملا نہیں؟" بولے "لعنت ہے باورچی بھیجا تھا یا بھنگی! اپنی ہی شکل کا ڈھونڈتے ہوئے" مرحوم نے نہایت سنجیدہ ہو کر جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب! کیا کروں آپ کی شکل والا تو یونیورسٹی والے نہیں چھوڑتے، کیا کیا جائے"

ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ اُن سے محبت کرنے میں اُسے لطف آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ ایک طرح کی پر افتخار اور اطمینان بخش تسکین جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ محبت کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے جیسے لوگ اپنے کتے سے کرتے ہیں! یعنی اُسے سمجھتے کتا ہی ہیں لیکن چومتے چمکارتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی محبت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں لیکن ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبت یا اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار سے لوگ انھیں انسان سمجھیں لیکن خود ان کے

جذبۂ فرعونیت کی تسکین ہو یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں اور اس طور پر اس کی زندگی میں اُمید و فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہم چشموں میں بیٹھنے اور سربلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح کی محبت یا عزت ایوب صاحب سے کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایوب صاحب وہ تھے جن کے لئے ہر شخص اپنی عزت یا شہرت کو داؤ پر لگا دینے کیلئے بے تامل تیار ہو سکتا تھا۔

ایوب سے محبت نہ کیجئے یا اُن کی عزت نہ کیجئے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا احساس ذمہ داری کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدنظر رکھئے کہ ایوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی گزری ہی نہیں کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں۔ معاوضہ کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و تن دہی سے کرتے تھے۔ پرووسٹ کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پر ہونے کے سبب ان کا سابقہ طلبا، اساتذہ بیرا، باورچی، نائی، چپراسی، بھنگی، بھشتی، سب ہی سے براہ راست پڑتا تھا۔ طلبا کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اُن کا ایوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ہر طالب علم کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے۔ اور اسی اعتبار سے اُن سے سلوک کرتے تھے اس لئے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ

اور خیراندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹرائک ہے، لڑکے ہیں کہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں لیکن ایوب صاحب کا جادو برابر کام کر رہا ہے۔ ایسے زمانہ میں ان کا طرزِ عمل لڑکوں سے وہی ہوتا جو میدان جنگ میں صلیب احمر کا ہوتا ہے:۔

ادنے ادرجہ کے ملازمین سے ان کا سلوک مساوات اور ہمدردی کا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ایوب کو اپنا افسر نہیں بلکہ رفیق سمجھتے تھے ایک دن میں نے دیکھا کہ بھنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہیں۔ اور بیا کہ ایسی کانفرنس میں ہوتا ہے، ہر بھنگی آپے سے باہر تھا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی سگریٹ پیتے اور بار بار پاجامہ اونچا کرتے جاتے تھے۔ ہر ایک سے مخاطب ہوتے تھے۔ کبھی خود جامہ سے باہر ہو جاتے اور کبھی نہایت متانت سے سمجھانے لگتے۔ میں اُدھر سے نکلا تو کچھ سٹ پٹائے اور شرمائے میں نے کہا واللہ، ایوب آج تو پہچاننا دشوار ہو گیا۔ جا کر مولینا[1] سے کہوں گا کہ نوح کا پسر بدوں میں بیٹھتے بیٹھتے بھنگیوں میں بیٹھنے لگا ہے! ہاتھ پہ ہاتھ مار کر بڑے زور سے ہنسنے کہنے لگے۔ ہاتھ جوڑتا ہوں ذرا بیٹھ جائیے۔ واللہ

---

[1] مولینا ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب قبلہ ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایوب صاحب کے عزیز قریب اور بزرگ۔

بڑا مزہ آئے گا۔ میں نے کہا، جی نہیں آپ کو کیا آج یہ ہے کل بھنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کرنے لگیں گے۔ فرمایا ہرج کیا پانی اور فنائل کا انتظام تو کہیں گیا نہیں —— غرض میں چلا آیا۔ ایوب صاحب بھی صدارت سے فارغ ہوکر تاش کھیلنے کے وقت پہنچ گئے۔

ایوب صاحب یونیورسٹی کے معاملات یا اُلجھنوں سے ہمیشہ علیحدہ رہتے اور حتی المقدور اپنے دوستوں کو بھی علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر اُنھوں نے مجھ سے کبھی گفتگو نہ کی۔ کبھی فرصت ہوئی اور یقین ہوا کہ میں گھبراؤں گا نہیں تو وہ اپنے خاندانی قضیوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا بیان کردیتے۔ اُن کی اُلجھنوں کو ہمدردی اور توجہ سے سنتا تو ایسا محسوس کرتے جیسے اُن کا جی ہلکا اور اُن کے دُکھ درد کا مداوا ہوگیا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے، سب کے سب ایوّب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انھیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک دن بہت اُداس تھکے آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بہل جائے معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک بیک آبدیدہ ہوگئے! میں نے پوچھا تو بڑے تامل کے بعد واقعہ سُنایا۔ وہی عزیزوں کی ذنایت اور شقاوت کا

میں نے کہا ایوب صاحب آپ بددل نہ ہوں آپ کا کوئی قصور نہیں
قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ خوش حال اور نیک نام کیوں ہیں۔ ہمارے
آپ کے اعزا کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھالی گئی ہے اغیار کو تو یہ
مسرور اور بافراغت دیکھکر خوش ہوں گے اور فخر کریں گے لیکن اپنوں
کو کھاتا پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم وغصہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے
یہ اپنے نکمے پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا بہت بڑا حربہ
سمجھتے رہیں۔ یہ اپنے کھاتے کماتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں
کہ آپ نے اُن تمام نعمتوں پر قبضہ مخالفانہ کر رکھا ہے جو بصورت دیگران
کے قبضہ میں آتیں۔ وہ کبھی نہ سمجھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور
بے ایمان ہیں اور جو فراغت، ناموری اور نیک نامی سے رہ رہا ہے اُس
نے کتنی محنت کی ہے اور اذیت اٹھائی ہے۔

اور یہ کچھ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ
اس انفرادی کمزوری اور کمینگی نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔
جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی سرمایہ ومزدور کی جنگ اپنی جگہ پر
حق بجانب ہے اور جہاں تک اس کے اخلاقی واقتصادی پہلوؤں کا تعلق
ہے اس کے معقول ہونے میں شبہ بھی نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس
اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے درپے بیشتر

وہی لوگ ہیں جو نکمّے، پرخود غلط اور کینہ پرور ہیں۔ دنیا کے کسی آشوب کا مطالعہ کیجئے آپ کو بالآخر یہی نظر آئے گا کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی آپ ہی سوچئے کیا مزدور اور کاریگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دنیا میں قابل عزت ولحاظ نہیں ہے دنیا کی نجات دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں ہے بلکہ محنت اور قابلیت کے صحیح احساس وتنظیم پر ہے۔ میں آج کل بازیگروں بازی گروں کے اصولِ تقسیم کا بالکل قائل نہیں جس سے "دولت" اُن کے ہاتھ میں جائے اور "مساوی" میرے ہاتھ میں رہ جائے!

آخر میں میں نے اُن سے کہا "ایوب صاحب! اپنا کام کئے جائیے دولت وشہرت کا حساب عزیزوں کو نہیں اللہ تعالیٰ کو دیا جائے گا۔ البتہ آپ اس کے لئے تیار رہئے کہ جتنا اللہ آپ کو کارگزار فارغ البال، نیک نام اور بھلامانس بنائے گا۔ اتنی ہی شیطنت آپ کی دشمن بنتی جائے گی"۔

مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے انھیں میرے ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملا کر بہت خوش ہوتے پھر بڑا اصرار کرتے کہ میں اُن سے اُن کے گھر پا جائے قیام پر جا کر مل آؤں یہی نہیں بلکہ جس کسی کو تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے یا اس کے ہاں خوشی کی کوئی بات ہوتی تو مجھے خبر کرتے کہ میں وہاں ہو آؤں میں ایسا کر دیتا تو اُن پر مسرت وشکر گزاری کا عجیب عالم طاری ہوتا ظاہر ہے اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ میری اس بھلمنساہٹ کی لوگ قدر کریں

لیکن یہ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا جس بات سے انھیں تقویت یا مسرت پہنچتی تھی اس میں وہ مجھے بھی شریک کر لینا چاہتے تھے دوسرے یہ کہ میں نے اُن کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اس پر استناد کی مہر لگ گئی تیسرے یہ کہ انھوں نے جس کو مجھے یا اس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھ ایسے (بزعمِ خود) معقول آدمی سے اسے متعارف کیا۔ بظاہر یہ باتیں دور از کار اور خود میرے بر خود غلط ہونے پر دال ہیں اور اپنے منہ سے ان کا تذکرہ کرنا میرے لئے بڑی بھدّی بات ہے۔ لیکن میں مرحوم کی بعض تحت شعوری سرگرمیوں سے واقف ہوں۔ ان کا مقصد وہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سنئے۔ ایک دن بڑے اصرار سے کہنے لگے کہ رشید صاحب پتلون پہنا کیجیے میں نے کہا آخر کیوں کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ آخر اس فرمائش کی تک کیا ہے۔ کہنے لگے جی چاہتے میں تُک کو کیا دخل۔ میرے ان کے ایک بے تکلف دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے یہ رد و قدح سُنی تو معاملہ کی نوعیت دریافت کرنے لگے میں نے بتایا تو اچھل پڑے کہنے لگے رشید صاحب قیامت تک نہ پہنیے گا۔ اس نے ایک پتلون سلوائی ہے۔ اُسے پہننا چاہتا ہے۔ آپ سے ڈرتا ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آئیے گا۔ دیکھوں تو کس طرح پہنتا ہے!

یونیورسٹی سے ایک قطعہ زمین مکان بنانے کے لئے میں نے پٹہ پر لی تھی

یہ ایوب صاحب کے مکان سے متصل تھی۔ برسوں میرے پاس افتادہ پڑی رہی۔ مرحوم کا مسلسل اصرار رہا کہ رشید صاحب مکان بنوا لیجئے ہر شخص بنوا رہا ہے۔ آخر آپ کیوں نہ بنوائیں تھوڑا سا حصہ چھوڑ دیجئے گا اس میں میں ایک جھونپڑا ڈال لوں گا۔ مویشی پالوں گا، مرغیاں رکھوں گا اور کھیتی کیاری کروں گا۔ میں نے کہا میں مکان نہ بنواؤں گا۔ ساری زمین آپ کی ہے۔ جو چاہے کیجئے مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سے کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں" کہنے لگے جی نہیں آپ مکان بنوائیے میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ یہاں آپ کا مکان ہو، آپ تمام روپیہ خرافات میں اٹھاتے ہیں، مکان ہوگا تو ایک چیز ہو جائے گی۔ آپ قریب ہو جائیں گے۔ وسیع عالی شان مکان میں سمجھوں گا میرا ہی مکان ہے، جب چاہوں گا چلا جایا کروں گا۔ ایک ٹھکانا ہو جائے گا۔"

مکان بنا لیکن ایوب کا ارمان پورا نہ ہوا۔ اب وہ اور ان کا ارمان دونوں یونیورسٹی کے گورستان میں آسودۂ راحت ہیں۔ یہاں پہنچکر مجھے بے اختیار اپنا چھوٹا چچا زاد بھائی جوانمرگ رفیق یاد آگیا جس نے بارہ تیرہ سال تک مرتے دم تک مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر اپنی روشن و رنگین زندگی کی وہ تمام متاع نثار کر دی جس کی قیمت اس دنیا میں آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔ آہ کیا نثار ہونا اور کس کس طرح نثار ہونا! جس نے تمام عمر یہ خیال ذہن میں آنے دیا کہ اپنی استعداد سے اپنے آپ کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنا چاہیئے بلکہ اسی کا قائل رہا

اور اسی پہ مرمٹا کہ اس کی ہر نعمت اور اس کی ہر متاع میرے اور میرے
بیوی بچوں ہی کو راحت و فائدہ پہنچانے کے لئے تھی۔

بہادر اور باوفا رفیق بھی مکان کا ارمان اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں
اپنا مکان دیکھکر مسرور و مطمئن ضرور ہوتا ہوں لیکن جب رفیق اور ایوب
یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہو کر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے یعنی کاش
دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انھیں اسی مکان میں گلے لگاتا ان کا خوش ہونا
اور دھوم مچانا دیکھتا اور مطمئن ہو جاتا کہ میں نے بھی کچھ کام کیا!

سردی کا زور اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں
کے ہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ ایوب مرحوم نے کہا سردی لگ رہی ہے
کسی نے توجہ نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد لیکن کسی قدر بے قرار ہو کر کہا۔ بڑی
سردی ہے۔ رشید صاحب میں چلا۔ ڈاکٹر عباد نے کہا "نہ ٹھکانے سے
کھاتے ہو نہ شریفوں کی طرح رہتے ہو۔ سردی کیوں نہ لگے"۔ یہ کہہ کر اندر
سے اپنا اونی گرم اور کوٹ لائے اور مرحوم کو اچھی طرح اڑھادیا چائے
منگائی اور پلائی۔ اس کے بعد بھی مرحوم نے کہا "رشید صاحب میں چلا" ہیں ان کے
لہجہ سے اور ان کے چہرہ کیطرف دیکھکر چونکا کھیل ختم کر دیا گیا اور ہم سب
انھیں اڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پر پہنچا آئے۔ صبح سے بخار نے زور پکڑا
لاکھ لاکھ جتن کئے گئے لیکن بخار اور کمزوری بڑھتی ہی گئی۔ دوستوں کی تشویش بڑھی

مایوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتہ کے اندر سب کچھ ہو گیا کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا تھا سب نے یہی فیصلہ کیا کہ وقت آپہنچا۔

شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر یونیورسٹی کے طلبا اور عمائدین کا مجمع تھا لیکن ان سے قریب اور ان ہی میں ملا جلا ایک اور ہجوم تھا۔ بھنگی۔ بہشتی۔ چپراسی۔ نائی، دھوبی۔ بیرے باورچی۔ خانساماں خوانچہ والے اور ان میں سے بعضوں کے بیوی بچے خاموش۔ مایوس سر جھکائے! اور یہ وہ ہجوم تھا جو کسی مرنے والے کے دروازے پر جب کہ وہ اس جہاں سے گزرنے والا ہو۔ میں نے گزشتہ پچیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔

مرحوم کو سپردِ خاک کیا گیا۔ مولینا ابوبکر صاحب نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا:۔

بھائیو! ایوبؔ اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے اگر اُن سے تم کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا۔"

گریہ سب کے گلو گیر ہوا کسی نے روکا اور کسی سے نہ رُکا!

ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک اور دردناک صدا بلند ہوئی:۔

کیا یہاں کوئی ایسا بھی موجود ہے جس پر ایوب کی خدمات کا صلہ واجب الادا نہ ہو" اس آواز کو سنا کسی نے نہیں محسوس سب نے کیا!

سر اقبال مرحوم

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!

بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُتر رہا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا تھوڑی دیر کیلئے بہت تھوڑی دیر کے لئے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت یہ بات صرف ایک آن کے لئے تھی، آسیائے گردشِ ایام ایک آن کے لئے رُک سی گئی لیکن فوراً ہی پھر رواں ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کا جی ہوا جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیئے طفلی کا زمانہ یاد آیا جب اقبال کے اشعار چھٹ پنے کی دوستی کی طرح مزیدار اور اور جان نثار معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں انہی میں رہتے بستے ہیں اقبال کی صورت وہی ہوگی جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔ بہت اچھی سی بہت چاہی جانے والی جیسی جادوگروں جیسی کچھ عجیب سی!

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ اب بھی جبکہ ادراک وشعور ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ۔ تھوڑی دیر کے لیے معلوم نہیں کیا چیز تصورات کو کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ وہی فسانہ وافسوں وہی روشنی و تاریکی لذت و اذیت خوف و امید جو بچپن میں پیدا ہوتے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں جہاں چاہتے ہیں لئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں

۱۹۲۵ء میں میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں نا قابل فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو پُر فکر و پُر لطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دل آویزی تاثرات پر

ہی نہیں بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے۔ اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشفی بھی۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا۔ کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عُقدہ (بو) باندھتے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے گٹھا ہوا جسم چوڑی چکلی ہڈیاں مردانہ انداز آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے بھاری بھرکم لہجے میں بولے آپ ہیں جی صدیقی صاحب! میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور اُن کا حُلیہ دیکھکر متحیر اور مرحوم کے انداز تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر دل گرفتہ ہوا۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ قلم کا تلفظ سُن کر میں گھبرا اٹھا۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن

ذہن میں معلوم نہیں کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوریوں سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابل بیان مروت و مرحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا جیسے ایک نیا تجربہ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا گو اس کا منتظر نہ تھا۔ جیسے مجھے ایک نئی حس تفویض ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں آ بیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے آواز بھاری تھی لیکن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی ہیں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سنا ہے یہی بات مجھے ذکر صاحب میں ملتی ہے علامہ مرحوم کی باتیں سننے بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو فوراً محسوس ہو گا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتی تھیں اور وہ صرف اپنے الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسہ کرتے تھے بلکہ

وہ باتیں کہیں دُور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھیں۔ ان کی گفتگو حشو و
زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی کہ ان کی بحث اتنی واضح اور جامع ہوتی تھی
کہ فصاحت و جامعیت بجائے خود صنائع و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں۔
گفتگو کرنے میں اِن کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتی تھیں۔ البتہ
جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تھی تو آنکھیں پوری کھل جاتی
تھیں اور چہرہ پر گرمی او روشنی جھلکنے لگتی۔

اُسی دن شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اُس وقت ایک
نوجوان شاعر آگئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے اُنکی شاعری اور لہجہ دونوں
پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ نوجوان کی گفتگو بہت تعلّی
زیادہ تھی ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بیزاری میں تبدیل ہونے لگی
تھی۔ کچھ دیر تو بیٹھے رہے اس کے بعد اُٹھ کھڑے ہوئے صحبت ختم ہوگئی صرف دو چار
اصحاب بیٹھے رہ گئے اندر سے دیر میں برآمد ہوئے چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا
تھوڑی دیر تک حقہ کا ٹھہر ٹھہر کر کش پیتے رہے اس کے بعد فرمایا قسمت کے مطابق
انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے اس کے بعد کچھ اور لوگ
آگئے۔ اب طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ ہر ایک سے پرسش حال کرتے وہ بھی
اس طور نہیں کہ موسم اچھا ہے یا بُرا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا نہیں جانتے تھے
ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کا مخصوص دُکھ سکھ سنتے۔ تو نکی مرحوم

کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ محبت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص مرحوم کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سنتا اور خود بھی بے تکلفی سے اپنی سناتا ؛

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا اس لئے بڑے اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں شروع کیں۔ اس زمانہ میں اقبال کے نظریہ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس پر میں نے خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ مرحوم نے بڑے ہی حاکمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور خود اعتمادی کے ساتھ جو ان کی سیرت کا بڑا ہی گراں قدر پہلو تھا اظہار خیال کرنا شروع کیا مجھے اس وقت جو چیز سب سے عجیب اور خوش آئند معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مرحوم کس خوبی سے واضح کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے متنازعہ فیہ مسئلہ میں کوئی پیچیدگی تھی ہی نہیں عالمانہ و مخلصانہ نقطۂ نظر کی یہ کرامت ہے کہ ناگہانی پیچیدگیوں اور نامعلوم مسائل کا حل بڑی آسانی سے سامنے آجاتا ہے۔ اسی صحبت میں عورتوں کا درجہ فوق البشر بعثت نبوی کا وقت اور مقام فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گزشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا اعادہ میں بار بار کرتا رہا وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات تمام

کے تمام ان کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں بڑی غلطی ہے۔ مرحوم کی فکر و نظر
کا بہت کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور یہی نہیں
بلکہ اکثر کچھ ایسا بھی محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دورانِ گفتگو میں ان
پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہو گئیں!

فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے
مسودہ بھی ٹائپ ہو چکا تھا اور کافی ضخیم تھا۔ فرمایا ان مسائل پر میں بعض مستند علماء سے
تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے نزدیک کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع
کرنا سودمند ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کوچہ سے نابلد ہوں اس کے علاوہ میں
کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر علماء علمِ دین سے تو پورے طور پر واقف
ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہیں اور ماہرینِ فن
ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اس لئے ان پر ہمارے علمائے کرام مناسب رائے قائم کرنے
سے معذور رہیں۔ جب تک متنازعہ فیہ مسئلہ کی ماہیت نہ معلوم ہو اس وقت تک
ان پر صحیح حکم لگایا کیسے جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو
نوعیت ہے اس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولینا سید سلیمان ندوی صاحب
سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یہ فرمایا کہ
وہ ان دونوں بزرگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں یا کریں گے اتنا البتہ یاد
ہے کہ دونوں کے بارہ میں مرحوم نے اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا ؛

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا اور ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی بڑی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح انمیں یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ ان کو اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا اس کا سبب میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ وہ فلسفی مفکر اور متقن ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے اس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبر کو دخل ہوتا۔ چنانچہ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون داں اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط ہوتا۔

ان کی شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبر حکیم یا فلسفی کی بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے۔ ٹھیک اسی طور پر جذبات کا احتساب کرنا اور اس کو مناسب موزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیدیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور ایقان دوش بدوش کارفرما ملتے ہیں بحیثیت مجموعی ان کا کلام پڑھکر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک

حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں۔ بلکہ حکیم اور شاعر البتہ کہیں حکیم پہلے
اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں ایک دوسرے میں
ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب میرے نزدیک یہ
ہے کہ اقبال نے فطری ملکات کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے
ایک نئی حسین اور لازوال صورت یا نوعیت بخشی شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکر کا
طبعاً مفکر ہونا میرے نزدیک کوئی بہت بڑی نعمت نہیں ہے۔ نعمت تو وہ
توفیق ہے جو فطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے اور غالباً یہی توفیق
وہ توفیق الٰہی ہے جو انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے
بچاتی رہتی ہے بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیت کو فوز عظیم پر فائز کرتی ہے۔
علی گڑھ میں ایک دن دوستوں کی علمی صحبت میں حافظ کے مشہور شعر

صد باد صبا اینجا با سلسلہ می رقصد — این است حریف اے دل تا باد نہ پیمائی

پر گفتگو ہونے لگی۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر ایک نے خوب خوب موشگافیاں
کیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر اقبال سے رجوع کیا جائے چنانچہ مرحوم سے
استصواب رائے کیا گیا مرحوم نے فوراً ہی جواب لکھ بھیجا سرسری ہی کلمہ کیا
اور آخر میں لکھا کہ شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو [illegible]
کے اصول مد نظر رکھ کر پیش کرے اس لئے شعر کے مطالب جداگانہ بھی ہوسکتے
ہیں۔ البتہ متضاد نہ ہوں آگے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر اپنی واردات کا

پورے طور پر خود استقصا نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری کر دے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو اور جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لے۔ آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ ان رموز سے اپنا لے جو اس کے شعر میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں۔ شاعرانہ رموز نہ منطقیانہ رموز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ، وہ شاعرانہ ہی رموز ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہی دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ ایک دن صبح مکان تشریف لائے اس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی مشکل سے باہر آیا۔ میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رک رک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ہائے اُن کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا نہیں جی صدیقی صاحب کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا، اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے۔ اس کے بعد دیر تک اسی انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی

میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آہی نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہاں سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں مبتلا رہ کر عالم بقا کو سدھارے کاش کسی وقت میں حاضرِ خدمت ہو کر اُن کے لئے وہ کر سکتا جو انھوں نے میرے لئے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا۔ وہ خاصانِ بارگاہ سے تھے ان کا خدا سے خاص تعلق تھا۔ لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی میں خوب سمجھتا ہوں کہ گو معجزہ کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کون سی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے زائل نہیں کر سکتے۔"

زندگی کے آخر عہد میں مرحوم کو توسل تو دربار بھوپال سے ہو گیا تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرانے میں سر سید راس مسعود مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن مالی دقتوں کا سامنا تھا۔ اب اس سے نجات ہو گئی تھی دور آخر کی بیشتر مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی اگر افراد کی مانند اداروں کو بھی کوئی معاد ہے تو اسی نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجاتِ اُخروی تیقن ہے۔ اقبال کو غم روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک

بہت بڑی سعادت ہے چنانچہ اقبال کے بعض عقیدتمند سر راس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلوں پر مافوق رکھتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارہ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کریگی لیکن شکسپیئر کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا گوارا نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کیساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی موصوف کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغان حجاز میں دختران ملت کو یوں مخاطب کیا ہے

زشام ما بروں آور سحر را ‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌ بہ قرآں باز خواں اہل نظر را!

تو می دانی کہ سوز قرات تو ‌ ‌ دگرگوں کرد تقدیر عمر را!

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلامِ پاک سننے کے لئے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن کا واقعہ ہے مرحوم نے علی بخش کو آوازدی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا۔ قرآن کیا سنیں گی وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں سے فرصت ملے تو آئیں۔ میں کیا کروں۔ مرحوم خاموش ہو گئے پھر فرمایا صبر علی بخش صبر، یہ کام بھی) اتنا ہی ضروری ہے!

اہلِ نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ اُن کی فکر و فرزانگی شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ اُن کی آفاقی بصیرت کا پورے طور پر ترجمان ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں منفرد ملتے ہیں۔ اور جدا ہو کر پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار اُن کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں ایک واقعہ مولٰینا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کر دیا جائے۔ مولٰینا تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں یورپ جارہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے مولٰینا سے سوال کیا اور کیوں جناب راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ مولٰینا نے فرمایا

کیوں نہیں دوسرے صاحب نے پوچھا معاف فرمائیے گا کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کس کس قسم کی اور کون سی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں۔ اور وہی میں نے رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سننے کیلئے سراپا اشتیاق بن گئے۔ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ایک تو کلام پاک ہے اور دوسری دیوانِ داغ!

اسے محض ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھا جائے لیکن یہ بیان واقعہ ہو تب بھی میرے نزدیک اس سے مولینا کی پر تجمل شخصیت کی دلربائی کچھ بڑھ جاتی ہے۔ یہاں میں کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد و عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرداز و پرداخت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کے پہلے بچہ کی شیر خوارگی میں وفات پا جانے پر رنجور ماں کو تسکین و تشفی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا۔

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود
آہ! ازاں غنچہ کہ باد سحرا ورانہ کشود!

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے اقبال بے انتہا مسرور تھے۔ اور اس کو دیکھنے کے بیحد مشتاق۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دیئے بغیر بھوپال آگئیں اتفاق سے سر راس مسعود اور سر اقبال دونوں یکجا تھے سر راس

نے فرطِ اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو آغوش میں لینا چاہا، اقبال نے آواز دی نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر بھی غور کریگی یا نہیں کہ وہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانہ میں اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوشِ مادر سے سب سے پہلے براہِ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی!

ڈاکٹر صاحب نے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لئے ایک ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی بچوں کیساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ سہ چکی تھیں۔ میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ تک خط کتابت ہوتی رہی میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم اِن بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکر مند تھے۔ ان کو معاوضہ کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا۔ لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ

کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا کہ آپکا نقطۂ نظر میں پورے طور سے سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ آپ امتحاناً انھیں دو ایک ہفتہ کیلئے اپنے ہاں بلالیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے سب آپا جان کہا کرتے تھے۔ لاہور پہنچ گئیں ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے ان میں ہر ایک میں ان میں خاتون کی شرافت و قابلیت دیانت و امانت، محبت و مروت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسہ ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھر بار کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون [illegible] اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا ہے۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور آیا۔ [illegible] جب میں نے جاوید اور بانو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر [illegible] خاموش اور کم آمیز کھل کر ملنے یا بات کرنے [illegible] معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور [illegible] تھے اور جاوید ان کے کلام میں کہاں [illegible] تھا۔

لیکن میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہیئے تھا لیکن بانو بمشکل سے ۶-۷ سال کی عمر ہو گی کیسی تندرست چنچل ذہین اور خوبصورت بھولی بھالی بچی ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی !!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بانو حسب معمول میری چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی پھر باتیں کرنے لگتی لیکن رہ رہ کر کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتی میں نے پوچھا بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا، آپا جان، ابا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمکدار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے !!

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بانو سے عشق تھا چنانچہ بالکل آخری زمانہ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہو گئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں اس کی ہمجولی اور اس کا کھلونا سب ہی کچھ تھے۔ اسی سلسلہ میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرہ میں بانو تک کا آنا بند کر دیا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آگئی جہاں کوئی اور نہ تھا میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بانو ڈاکٹر اقبال کے سینہ پر بیٹھی ہوئی بے تکلف باتیں کئے جا رہی

ہے۔ میں پھر اُٹھی سر اقبال کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی میں نے دبے پاؤں قریب جاکر بانو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا۔ سر اقبال بول بھی نہیں سکتے تھے بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً بند آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لئے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ بانو کے اس طرح موجود ہونے سے جیسے اُن پر ایک گونہ اطمینان سا طاری تھا۔ اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنے جذبہ امتنان و مسرت سے ایک لمحہ کے لئے اور اُبھارے اور روشن کئے ہوئے رکھنا چاہتے تھے!

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو ان کا گریہ گلوگیر ہو جاتا ہے اُن کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا۔ جب میں پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب پورے کپڑے پہن کر آئے اور انھوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انھوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلف سے مستثنیٰ کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ صرف بنائن اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرہ ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسہ کرنے کا عجیب مادہ تھا میری کسی تجویز کو انھوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے زیادہ کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے

اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمھارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متمنی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا شاہی مسجد کی پائیں بائیں سمت اِس مرد قلندر کو آسودہ خاک پایا مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اُس اقبال کی آرام گاہ ہے ؂

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے

اور آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پُراسرار و پُروقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اس درجہ اور اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نہ ہوتی۔

اقبال زندہ تھے تو اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اُن سے مل آونگا اور اس کا یقین تھا کہ اُن سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہوگی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے ولولوں کو بڑھائیگی۔ ذہن کی کچھ الجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال انھیں سلجھا دیں گے کبھی

محنت و مطالعہ سے بچنے کے لئے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کیجئے کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اطمینان کر لوں گا۔

جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض کریہہ یا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اُٹھ جانے سے سب کے سب درہم برہم ہو گئے اب نہ وہ ولولہ رہا کہ اُن کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ اُمید کہ اقبال جیسا رفیق و رہبر ملے گا جو اُن کی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا۔

اقبال کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ وہ اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اُس ایک بات سے بے شمار نئی اور عجیب باتیں از خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اُن کی اس ایک بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہِ راست نہیں رکھتی تھیں۔ اُنکی بتائی ہوئی باتیں صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ اُن راستوں پر مجاہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا تھا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ نہ ہوں میرے لئے تو وہ بہت کچھ تھے میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپکو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر یہ شاعری ہے تو پیمبری کیا ہے؟ اور یہ پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے؟

احسن مارہروی (مرحوم)

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں! (میرا)

مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبۂ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو اُن سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر اُن کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردو داں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ اور شاعری کے ان لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو اُن کے پیشرو (

روؤں سے ان تک پہنچتی تھی۔ بایں ہمہ وہ اُردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دبستان کے نقطۂ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے خواہ شاعر کا مسلک اُن کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید اُن کے سامنے مروج و مقبول ہوئی وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اُردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے اپنے خیالات و تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے اس اعتبار سے اُن کو ترقی پذیر اور ترقی پسند قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہیئے ترقی پذیر یا ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سُنے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھرکم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اُس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو تامطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا

آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آ رہا ہو۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے مطلب بر آری نہ ہوئی تو بلا کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتائے۔

اس بارۂ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جوان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سعی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے میں نے یہ بات جرمن پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لئے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے ؛

پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے ہنس مکھ۔ بات کرنے کے شائق۔ متوسط جسم، لمبا قد۔ عینک لگائے ہوئے اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے ضرور لائبریری پہنچتے ہیں پروفیسر کرنکو کو کسی نہ کسی

علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب کرتے ہوئے بتاتا۔ گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اسے مخاطب کرکے جس حد تک بحث ہوچکی ہوتی اس کا خلاصہ سنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار (MODEL DELUXE) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت کم لوگ کرپاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دیکر بتایا۔ اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی !!

باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر حسن مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سنا ہے اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھنے کہتے تھے استاد داغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقے میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر تانیث یا محل استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کردیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اردو میں آتے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنیوالے بعد میں لکھتے کہ مولانا

مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اُردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔
کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرتے۔ کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں
ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف
اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولانا کی
صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے ان کے خلوص اور شگفتگی
کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا
تھا۔ بوڑھوں میں ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ
سمجھتے ہیں۔ نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن میں ان
سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب
نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سن لوں
ساری عمر اسی میں گزاری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں
تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر
ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کبھی تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے
ایک دن شعبہ اُردو میں ایک صاحب تشریف لائے یہ گورداسپور
میں ریلوے میں ملازم تھے۔ مسودات کا بستہ ساتھ تھا۔ اُردو شعراء کا
ایک مبسوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غریب نے ملازمت

کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی اسی اثناء میں مرحوم تشریف لائے۔ نو وارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسودہ کی طرف مائل ہوں۔

مولانا نے مطلقاً التفات نہ کیا۔ اس سے نہ تو نو وارد کی دلجمعی ہوئی اور نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کو اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں حاضرین نے بھی شہ دی مولانا نے کسی قدر اُکتا کر مسودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہہ کر مسودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کرکے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بغیر ان کی طرف رُخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی۔ مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جراٴت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا۔ کانا اور نے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رُخی سے ہم سب بھی خفیف ہوئے میں نے عرض کیا

مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں
فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم۔ فرمایا وہ تو
ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور
چاہیں تو چائے مفت میں پلوا دیں!

مولانا بے ساختہ ہنس پڑے اور نو وارد سے کچھ التفات فرمایا اور
بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے
دل میں ان کی سمائی نہیں۔ اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا
کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا۔

ایک بار ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی رازداں سمجھ کر ایک معاملہ
میں شریک کار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے عجیب
حیص بیص میں مبتلا تھے میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بد نصیبی سے مولانا کے
دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب "سینۂ بسمل سے پرافشاں" نکلنا چاہتا ہے
میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سُنی اَن سنی کرتے جاتے
تھے اور جب انھیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح اُن کی ہمت افزائی
کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھر
کم جسم کو اس طرح تولایا اُس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے

گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور دکان میں آکر بھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔ میں ان کے ارادہ سے واقف ہو گیا میں نے بھی ایک لمبا سانس لیکر اپنی کرسی اُن سے اتنی ہی دور کر لی جتنی اُنھوں نے قریب کی تھی مولانا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ اُنھوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا اور نفسِ مضمون پر آنے کی جارحانہ شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پسپا نہ ہوں گے۔ چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اُٹھ کر بھاگا۔ مولانا بایں جسدِ عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے۔ اسلیئے اُنھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سُنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی (REAR GARD ACTION) ریر گارڈ اکشن (جنگِ پسپائی) سے پوری طور پر واقف تھا میں نے بھاگتے ہوئے جواب دیا جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں۔ مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے۔ میں دروازے سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا۔ مولانا نے راز فاش کر دیا بتاؤ؟

۵۱۔ اس سلسلہ میں غالبؔ مرحوم کا ایک شعر آپ کو یاد ہو گا ؎

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق | جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے!

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے اور اس خاندان کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مرحوم کی خاندانی عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے علم وفضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور پہ وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولانا کے قریب جاکر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں چھوٹے

بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے کرتے پاجامے، سر پر بال باریک ترشے ہوئے پاؤں میں جوتا۔ سر پر ٹوپی چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شستگی وشائستگی پائی جاتی تھی ؛

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع اقسام کے نیکر اور قمیص پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے۔ بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ یہ قل اعوذیت تھی۔ قل اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن لسوانیت یا شہدپن کے مقابلہ میں قل اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دے سکتا۔ لباس وجسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے

نئی زندگی دینا زمانہ مجموعۂ صد کرامات سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے:

مرحوم پرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چوبیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے۔ مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے ہر جگہ ان کی پزیرائی خوش دلی سے کیجاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے اور تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے۔ نہیں کر سکتے تھے اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیسی کر گزرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے۔ اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم دو دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی اُن پر فقرے بھی چست کرتے تھے

ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا۔ بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجتمندوں کو بہت کچھ دیا اب جب کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو۔"

مرحوم شاعری کے قدیم دبستان کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری تصنیف و تالیف تحقیق و تدقیق میں گزاری۔ اپنے استاد کے مسلم الثبوت پیرو تھے لیکن کلام میں استاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی شوخی رنگینی و جدّت آفرینی نہ تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان محاورہ مصطلحات متعلقات شاعری کے سمجھنے پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اُٹھتے جا رہے ہیں۔ صحت زبان مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس برتے پر کرے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن فن کے واقف کار کہاں فنی تبحّر بڑی اہم چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے۔ اس لئے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے شعر کہنا اُن کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا کئی سال ہوئے

دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیٰ حضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحہ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا۔ عالم یہ تھا کہ شعبہ اُردو میں بیٹھے ہوئے ہیں ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصّہ لے رہے ہیں۔ ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہو گئی مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیشِ نظر ہوں۔

ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرعہ طرح دے دیا جائے اور اُن سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولانا مرحوم یہ سُن کر آپے سے باہر ہو گئے۔ آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے تو اُن کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا۔ ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستین

چڑھالی اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے میاں ہوش میں آؤ۔ یہ کیا یک گئے شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اُس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تاپڑ توڑ جوتے اس وقت مصرع طرح دو۔ پھر دیکھیں کون کتنے پانی میں ہے۔

مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقتہ الشعر کے صدر ہیں۔ اگر مجوزہ آداب آئندہ سے نافذ کر دیئے جائیں تو کیا ہو۔ مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے۔ کہنے لگے "بڑا اچھا ہو" کم بخت گویوں سے نجات ہو جائے!

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "فصل" میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھچکر آتے ہیں اور صید و صیاد دانہ و دام تمنّا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صفِ اول میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں یکہ بانوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ایک مصرعہ مجھے اب تک یاد ہے ؎

کہاں لے جاؤں دل دونو جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ بھلے مانسوں کے سیدھے سادھے لب ولہجہ میں یہ رُباعی پڑھی ؎

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اُچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے اس شعر پر جو صفِ اول کو مدنظر رکھکر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرہ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ؎

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت ؎ یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا بڑے لطف و انہماک سے اس کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی چہل پہل کے گزرتے۔ ہر شاعر کا پورا پورا حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے تھے سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا ؎

اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا۔ چنانچہ رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدردانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔

توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اُس زمانہ میں یہاں پر وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دئے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو کی بھی خیر نہیں میری طلبی ہوئی۔ مکالمہ سنئے۔

صاحب (لال بھبھوکا ہو کر اور مع کرسی میری طرف رخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں (متعجب و سراسیمہ ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے جناب؟

صاحب۔ (تقریباً دانت پیس کر) بے شک۔ مولانا صاحب نے کیوں درخواست دی' ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت برتی!!

میں۔ جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہو گی ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہیئے۔

صاحب (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں؟
میں۔ شعر پڑھنے!
صاحب۔ شعر!
میں۔ شعر جناب والا!
صاحب۔ اپنے شعر؟
میں۔ مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔
صاحب۔ لیکن یہ ہوا کیا؟
میں۔ ہوتا ہوا تا کچھ نہیں عالی جاہا، لیکن مانتا کوئی نہیں۔
صاحب۔ تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے؟
میں۔ جناب والا میں نالائقی تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب اُن سے کبھی گفتگو فرمالیں بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔
صاحب۔ بہت خوب، مولانا صاحب کو میرے ہاں لانا (کسی قدر زہر خند فرما کر) مجھے اب تک اُن سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

پرووائس چانسلر صاحب کو مولینا کی واپسی کی اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ مولانا کو دیکھ کر صاحب یکلخت جھجکے اور فوراً

ہی سرو قد ہو کر مولانا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرم جوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرسانِ حال نہ تھا البتہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ نور فش بجا لانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے، یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سرو قد کھڑے ہو گئے میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہو گا۔ لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہو گئی۔"

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبار شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے۔ اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزردہ و برہم چلے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آگئے معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی۔ فرمایا رشید صاحب! طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گزاری اور تفریح و تفنن کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کریں علم تو ان کو آنے کا نہیں! میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجئے گا۔ یہ طلبار کا

قصور نہیں ہے۔ دنیا کا یہی رنگ ہے۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر و قیمت رکھتی تھیں وہ اب مردود ہو چکی ہیں۔ حفظ مراتب اٹھ چکا ہے یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کڑھیے نہیں۔ لڑکوں کو معاف کر دیجیے۔ ان کو نہیں معلوم وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کے شکار ہیں۔ مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا بولے جی نہیں میں نالائقوں سے کوئی سرو کار نہیں رکھنا چاہتا مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجیے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا میں نے عرض کیا۔ مولانا فرض کیجیے۔ یہ لڑکے بڑے نالایق ہیں۔ آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجیے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجیے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں۔ اور بڑوں کی نالائقی انگیز کرتے ہیں۔ مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انا للہ۔ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا نصف پیالی شکر اور نصف چائے۔ اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے تھے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو در کنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ذیابیطیس کے پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پروا نہ کرتے تھے۔ اس وضعداری نے کاربنکل سے دوچار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعادِ عمر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام لیا کرتے تھے جو ان سے بہت کم

عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ اُن کے قوائے ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند پارساؤں میں پارسا۔ خوردوں میں خورد بزرگوں میں بزرگ کیسے کیسے زمانے کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۳۰ راگست ۱۹۴۷ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہنچ گئی۔

اگست ۱۹۴۷ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا مکان سے یونیورسٹی آ رہا تھا کہ خبر ملی مولانا حسن کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے اور کیوں حضور سنتا ہوں خنداں شائع ہو گئی میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے، پڑھ کر واپس کر دوں گا کہاں مرض الموت کا یہ کرب کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب، اللہ اکبر! میں مبہوت ہو گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت مستوی ہو گئی ہے، میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدارا کتاب بھیج دیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں! عجیب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی

سیّد محفوظ علی

(یہ تقریر گدڑی کے لعل کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیگئی تھی۔ بعد نظر ثانی اس مجموعہ میں پیش کیجاتی ہے) مرتب

سیّد محفوظ علی صاحب بی۔ اے علیگ کا ۲۰ اکتوبر ۴۳ء کو انتقال ہو گیا۔

گدڑی کا یہ لعل بدایوں کی مردم خیز زمین سے اٹھا اور کم و بیش ۲۷ سال کی خزاں و بہار لیے ہوئے لالہ و گل میں نمایاں ہونے کے لئے بدایوں ہی کی خاک میں پنہاں ہو گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ تقریر جو اُن کی زندگی پر اور اُن کی زندگی میں ہونیوالی تھی آج خطبۂ میت بن جائے گی۔ جو لوگ مرحوم سے واقف نہیں وہ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے کہ پروانہ کی خاک کس رونق محفل کی یادگار تھی:

مرحوم علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور مولانا شوکت علی اور مولینا محمد علی کے ساتھیوں میں تھے۔ بڑے بھائی سے چھوٹے اور چھوٹے سے بڑے۔ حیدرآباد میں مولوی عزیز مرزا مولینا شبلی رحمتہ اللہ علیہ اور مولینا شرر مرحومین کی صحبتیں

دیکھ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ ایسی ہستیوں کا گہوارہ تھا جن کے نام
اور کام کی شہرت اب بھی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں گونج رہی ہے۔ سید صاحب
کا علی برادران سے اوائل طالب علمی ہی سے نہایت گہرا اور مخلصانہ تعلق رہا جو
بریلی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس سے شروع ہو کر علی گڑھ کالج پر ختم ہوا مولینا محمد علی
سید محفوظ علی سے چھوٹے تھے۔ اتنے چھوٹے کہ سید صاحب ان کی گوشمالی بھی
کردیتے تھے۔ مولینا محمد علی گوشمالی ہی نہیں بزن و بکش کا جو ملکہ حاصل ہو گیا تھا
معلوم نہیں اس میں گوشمالی کو کس حد تک دخل تھا؟

سید صاحب نے عربی فارسی میں تکمیل کرنے کے بعد انگریزی کی طرف رجوع
کی۔ انگریزی کے مدارج ۱۸۸۰ء تک علی برادران کے ساتھ بریلی میں طے کئے اور
۱۸۹۳ء میں علی گڑھ آئے اور ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سید محمود
مرحوم کی وساطت سے دربار خیرپور پہنچے ۱۸۹۶ء سے سلسلۂ ملازمت شروع
ہوا ۱۹۰۱ء میں سندھ کو خیرباد کہہ کر بمبئی آگئے وہاں سے جلد ہی ترجمہ کی خدمت
پر مامور ہو کر حیدرآباد پہنچے ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ کے مشہور پرنسپل سر مارلین کے
ایما سے سومالی لینڈ (افریقہ) میں ججی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہاں سید صاحب
نے اپنے فرائض جس دلیری اور خوش اسلوبی سے ادا کئے اس کا تذکرہ اس موقع
پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ۱۹۰۷ء کے بعد ہندوستان آئے اور آخر وقت تک وطن میں
رہے یا مولینا محمد علی مرحوم کے پاس دہلی میں ہمدرد کا کام سنبھالتے رہے بد

مولینا محمد علی کو سید صاحب سے دلی شغف تھا وہ شروع سے آخر تک قائم رہا کامریڈ اور ہمدرد کا خواب دونوں نے مل کر دیکھا تھا اور اس کی تعبیر و تشکیل میں دونوں شریک رہے۔ ایک صحرا کو نکل گیا۔ دوسرا بدایوں کے گلی کوچوں میں بھی رسوا نہ ہوا۔ مولینا محمد علی کے مزاج میں جو بے پایاں شدت و حرارت تھی جس نے ان کو ہمیشہ نعل در آتش رکھا جس کی وجہ سے کوئی وجہ سے کوئی شخص مولینا کے ساتھ یکسوئی اور استقلال کے ساتھ کام نہ کر سکتا تھا اور جس تپش و طوفان کے بالاخر وہ خود نذر ہو گئے، اس نے سید محفوظ علی کو کبھی متزلزل نہ کیا سید محفوظ علی نے اس مہر نیم روز سے روشنی اور حرارت بھی اکتساب نہ کی۔ محفوظ علی اپنے نظام شمسی خود تھے

مولینا محمد علی کامریڈ اور ہمدرد کا دفتر کلکتہ سے اور سید محفوظ علی کو بدایوں سے دلی لائے۔ اس زمانہ میں ہمدرد میں مضامین کا ایک سلسلہ "تجاہل عامیانہ" کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوا جس کے مصنف سید صاحب تھے۔ یہ مضامین اس زمانہ میں اخباری طنز و ظرافت کا اعلیٰ نمونہ قرار دئے گئے۔ مولینا محمد علی اور ولایت علی بمبوق کے مضامین دیکھنے کے لئے لوگ جس طرح کامریڈ کے لئے بیتاب رہتے تھے تجاہل عامیانہ کے مطالعہ اور پذیرائی کے لئے ہمدرد کے منتظر و مشتاق رہتے تھے "تجاہل عامیانہ" میں اس زمانہ کے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بڑی لطیف تنقید ہوتی تھی۔ تجاہل عامیانہ کی تقلید میں مدتوں مضامین لکھے گئے اور سید صاحب کا یہ تصرف عرصہ تک ہمارے انشاء پردازوں کے ذہن و قلم پر کارفرما رہا

سید محفوظ علی میں وہ تمام صفات نہ بھی موجود ہوتیں جن کا یہاں احاطہ کرنا نہایت مشکل ہے تو میرے نزدیک ان کی یہ صفت سب سے اونچی تھی کہ انھوں نے اس زمانہ میں بھی شہرت نہ چاہی جب شہرت بڑی مشکل سے حاصل ہوتی تھی لیکن وہ بڑی آسانی سے مشہور ہو سکتے تھے۔ اور اب جبکہ شہرت ماری ماری پھرتی ہے وہ تقریبًا گمنام ہو گئے تھے۔ میر صاحب کے بیشتر مضامین فرضی ناموں سے شائع ہوئے۔ کبھی ملّا یودھاموی کے نام سے، کبھی شمع بے نور اور کبھی آق سقال کے نام سے یہ بھی ایک سبب ہے کہ میر صاحب کو عام طور پر لوگوں نے بہت کم جانا پہچانا۔ ہر بڑی شخصیت اور ہر بڑے کارنامے کے پیچھے عام نظروں سے اوجھل بظاہر ایک نہایت معمولی اور ناقابلِ التفات لیکن درحقیقت نہایت پختہ کار ہستی ہوتی ہے اور اس کو تقویت بھی پہنچاتی رہتی ہے۔ یہ ہستی جدال و قتال کے میدان اور عیش و طرب کی محفل دونوں سے علیحدہ رہتی ہے لیکن میدان و محفل دونوں میں اسی کا عمل و دخل پوشیدہ رہتا ہے ایک مدت تک مولینا محمد علی پر سید محفوظ علی کا اسی قسم کا اثر اور تسلط رہا۔ سید صاحب کے درجہ کو متعین کرنے کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ مولینا محمد علی سید محفوظ علی سے بے جھجک ہونے کی ہمت نہ کر سکے جو لوگ مولینا محمد علی کی بت شکنی اور خود شکنی سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سید کا وہ کون سا سکوت ساحل تھا جو سمندر کی سطوت سے باخبر بھی تھا اور بے پروا بھی علی گڑھ پر سے ترکِ موالات کا سیلاب گزر چکا تھا۔ موجودہ مسلم یونیورسٹی سے

قریب ہی ایک وسیع بنگلہ میں مولینا محمد علی نے جامعہ اسلامیہ قائم کر دیا تھا۔ ایک بڑے ادارہ کو وجود میں لانے کے لئے وہ بھی ایک بڑے ادارے کے مقابلہ میں مولینا محمد علی ایسی بے پناہ ہستی کم سے کم مدت میں جو کچھ کر سکتی تھی اور جو کچھ نہ کر سکتی تھی وہ سب موجود تھا ہر طرف ہر قسم کے آدمی اور ہر طرح کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن میں بھی جا نکلا کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا کہ کیا ہنگامہ بپا تھا۔ جب اس تمام ہنگامہ کا مرکز مولینا محمد علی کو قرار دیدیا جائے مولینا بیک وقت طلبا، علما، والدین باورچی، ٹھیکہ دار، قلی، تھانہ دار، اخبار کے نامہ نگار، کوئے کتے، فقیر، خوانچہ والے سے مصروف کارزار تھے۔ اس رستخیز میں ایک طرف چاندنی کے فرش پر سکوت اور متانت کے ساتھ ایک بزرگ دوزانو بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ چھوٹا سا قد مختصر جسم کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی سفید گول مختصر سی ڈاڑھی آنکھوں میں بچوں کی معصومیت جوانوں کی تازگی اور صاحب کرامت کی تب و تاب لیکن بحیثیت مجموعی مہر و وفا کی نرمی و نزاکت میں ٹھنک سا گیا اردگرد کا سارا ہنگامہ دل سے محو ہو گیا۔ یہ میر محفوظ علی تھے۔

میر صاحب کی خلقی شگفتگی و ملاطفت سارے ہنگامے پر غالب تھی۔ پریس کا کام بھی جاری تھا۔ کاپی اور پروف چلے آرہے تھے۔ کچھ لوگ ترجمہ کا کام کر رہے تھے وہ بار بار میر صاحب سے رجوع کرتے تھے، بعض قلمی نسخوں کی تصحیح و تحشیہ میں مصروف تھے وہ میر صاحب کے پاس آتے جاتے تھے۔ میر صاحب ہر ایک کو برجستہ اور بڑے لطف سے مطمئن کر دیتے تھے، اس درمیان میں کبھی کبھی مولینا محمد علی بھی گرجتے برستے

ادھر نکل آتے تھے۔ میر صاحب کے پاس پہنچتے ہی یہ شمشیر و سناں اول طاوس و رباب آخر میں تبدیل ہو جاتا تھا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے۔ شعلہ و شبنم کا قران بھی دیدنی تھا!

میر صاحب کی عربی فارسی کی قابلیت کا لوہا خود اُن کے اُستاد طالب علی کے زمانہ میں مانتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور اور ہر ماخذ پر سید مرحوم کو پورا عبور تھا، مولینا محمد علی بھی تاریخ کے بڑے جید طالب علم تھے اور اس بارہ میں سید صاحب کی علمی معلومات اور مورخانہ تعبیروں پر بڑا بھروسہ کرتے تھے۔ اسلامی علوم میں سید محفوظ علی کو بڑا درک تھا اس جہت میں بھی مولینا محمد علی ان کے قائل تھے۔ مولینا محمد علی کا "بگڑنا" بھی ایک حادثہ ہوتا تھا اس پر سید صاحب کا مسکرانا اور چپکے سے کوئی لگتی ہوئی بات کہہ دینا اور اس طور پر کہنا کہ مولینا کا جو ہاتھ گرز بن کر اٹھا تھا وہ سید صاحب کے گلے میں حمائل ہو جاتا۔ آخر عمر میں سید صاحب نے تفسیر کلام پاک کا ایک مخصوص اور مختصر حلقہ اپنے ہی گھر پر اپنے احباب اور عقیدتمندوں کے لئے قائم کر لیا تھا۔ جو لوگ کلام پاک کی تفسیر و تعبیر کی نزاکتوں کو جانتے ہیں وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ سید صاحب نے یہ کام کس بل بوتے پر شروع کیا تھا، اور اس سے ان کی فضائل علمی اور واردات قلبی پر کیا اور کیسی روشنی پڑتی ہے:

برمحل اشعار پڑھنے اور پیش کرنے کا جو کمال میں نے مولینا محمد علی اور مولینا ابوالکلام آزاد میں پایا وہ کہیں اور نہ ملا۔ معمولی سا شعر بھی یہ کسی موقع پر پیش کر دیا

کرتے تو موقع کی مناسبت اور استعمال کی برجستگی سے خود شعر کا پایہ بلند ہو جاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی بل کی موافقت و مخالفت میں دو گروہ بن گئے تھے مخالفین میں مولینا ابوالکلام اور مولینا محمد علی تھے۔ کچھ اسباب پیش آئے کہ مولینا محمد علی بل کی موافق جماعت میں شریک ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس واقعہ پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان یہ شعر تھا ؎

معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

مولانا محمد علی نے مضمون دیکھا تو تلملا اٹھے برق و باد بن کر سید محفوظ علی کے پاس پہنچے۔ دروازہ اس طور پر کھٹکھٹایا جیسے مکان کی چھت گرا اور بنیادیں ہلا دیں گے۔ سید صاحب کو پا کر بولے ابوالکلام کے شعر کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ سید صاحب نے پوچھا کیا شعر ہے اور کس موقع پر پیش کیا گیا ہے۔ مولینا نے جلدی جلدی شعر سنایا اور مضمون کی نوعیت بتائی۔ اس دوران میں سید صاحب کو جھنجوڑتے بھی رہے سید صاحب نے برجستہ کہا، لکھو ؎

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن!

مولینا جھومنے لگے۔ بولے معرکہ سر ہو گیا۔ اس موقع پر مولینا نے اعتراف کیا کہ اس بارہ میں سید کا دماغ کچھ کم رسا نہیں ہے!

گزشتہ جنگِ عظیم کے سلسلہ میں مولینا محمد علی کا ایک معرکتہ آلارا مضمون CHOICE OF THE TURKS شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جارہا تھا بحث یہ تھی کہ CHOICE کا اردو مترادف اس موقع پر کیا ہوگا ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا تھا لیکن اطمینان کسی کو نہ ہوتا۔ بالاخر یہ مسئلہ سید صاحب سے رجوع کیا گیا سید صاحب نے موقع محل دریافت کرکے فوراً بتایا "چارۂ کار" ظاہر ہے اس موقع پر چارۂ کار سے بہتر کوئی اور لفظ ہو نہیں سکتا۔

سید صاحب ہمیشہ اور ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے اور تقریباً ہر موضوع کو نا تمام چھوڑتے یہ کسی معتقد کا کمال ہی ہوتا کہ وہ سید صاحب سے مکمل مضمون حاصل کر لیتا۔ نا تمام مضامین کا ایک پنیا بازار ان کے صندوق میں مقفل ہے۔ دیکھئے کب اور کس کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ وہ ان کو مرتب اور مدون کرتا ہے ان سب کے علاوہ اردو میں طنز وظرافت کو پھکڑ اور فحاشی سے نکال کر خاصہ کی چیز بنانے میں سید مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔ سید صاحب کا دماغ حاضر اور ذہن رسا تھا۔ وہ زندگی کے ان پہلوؤں کو فوراً تاڑ لیتے تھے جن پر طنز وظرافت کا وار ہو سکتا تھا

سید صاحب کی ظرافت میں ایک طرح کی BUOYANCY ملتی ہے بعضوں کی ظرافت "ٹھوس اور ٹھس" جیسے پانی میں سیسے کا ٹکڑا گر کر تہ نشین ہو جائے بعضوں کی سیال ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر پھیل کر فضا میں غائب ہو گئی سید کی ظرافت کی مثال کنول کے پھول سے دے سکتے ہیں۔ پانی کا اتار چڑھاؤ

کیسا ہی ہو پھول برابر شگفتہ ۔جھومتا اور تیرتا رہے گا ۔ ان کی ظرافت میں ان کی شخصیت اُجاگر رہتی ہے ۔ وہ الفاظ سے بھی کھیلنے کے شائق تھے ۔اُن کے ظریفانہ مضامین میں "رعایات ومناسبات" کا اچھا خاصہ عنصر ملتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اب قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی ۔لیکن وہ ان رعایات کو رعایت کی خاطر بہت کم استعمال کرتے تھے وہ ان میں "موقع و ماحول" کا ایسا رنگ بھر دیتے تھے کہ ان میں واقعیت جھلکنے لگتی تھی ۔ ایسی واقعیت جو آرٹ میں جان پیدا کر دیتی ہے ۔ شیخ سما اللہ کی صاحبزادیاں کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ سید کے ذہن کی رسائی اور قلم کی شگرف کاری کس کس طرح سے اور کن کن نازک اور دقیق لمحوں میں بروئے کار آئی ہے ۔سید کا دور او دھ پنچ اور رعایات ومناسبات لفظی کے فوراً بعد کا دور ہے اس لئے سید اور ان کے پیشروؤں کی صناعی و صنعت گری میں ربط ملتا ہے ۔ البتہ یہ سید کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے پیشروؤں کے ادبی اور زوال پزیر ٹکنک کو ترقی دے کر اس طور سے ختم کر دیا کہ اس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہ چھوڑی لیکن سید کو جو چیز ایک طور پر ترکے میں ملی تھی اس کو انھوں نے ادبی و فنی نقطۂ عروج تک پہنچا کر بس نہیں کیا ۔ بلکہ "رعایات ومناسبات" سے گزر کر مبصرانہ ظرافت کی تخلیق کی اور ظرافت کے تانے بانے میں طنز کی ایسی بوقلموں دھوپ چھاؤں پیدا کر دی کہ فن کے ترقی کے امکانات بہت زیادہ وسیع ہو گئے ۔ "صاحب دین" میں اس مبصرانہ ظرافت کے بڑے اچھے نمونے ملیں گے ۔

سید کی انشا پردازی کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان کو عورتوں کی صحیح و شستہ زبان لکھنے کا بڑا ملکہ تھا اور وہ اسی زبان میں بڑے پتے کی باتیں بڑے لطف سے بیان کر جاتے تھے۔ عورتوں کی زبان لکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا اس زبان میں اہم اور مشکل باتوں کو خوبی اور خوبصورتی سے سمونا مشکل ہے شیخ سمارا اللہ کی صاحبزادیوں پر جو مضمون سید صاحب نے لکھا ہے وہ ان کے گہرے مطالعہ اور صناعانہ چابکدستی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ سارے مضمون میں ایک طرح کی ڈرامائیت جاری وساری ملتی ہے۔ اس طرح کے مواد کو اس انداز سے ڈھالنا اور یہ آب و رنگ پیدا کرنا ہمارے ادب میں مدتوں یادگار رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اصلی معنوں میں صحیح اور اچھی اردو لکھنے کے شائق ہوں ان کو ہماری عورتوں کی زبان کا شوق اور سلیقہ سے ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ بغیر اس کے زبان کی روح تک رسائی بہت مشکل ہے۔ عورتوں کی اس زبان میں وہ تمام عناصر و عوامل بہترین ترکیب میں ملتے ہیں جو ہمارے تمدن میں کبھی قابل فخر سمجھے جاتے تھے۔

کئی سال ہوئے ایک سلسلہ میں بدایوں جانے اور سید صاحب کا مہمان بننے کا اتفاق ہوا۔ شاید دو روز ٹھہرنا پڑا تھا۔ مہمان نوازی کے بارہ میں تو مجھے کچھ کہنا نہیں ہے کسی مسلمان کا یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہوتا۔ یہ تو اس کی عرب سرشت میں داخل ہے۔ مجھے جو چیز سید صاحب کی نہایت درجہ دلکش معلوم ہوئی وہ اُن کی ذہانت شگفتگی تھی جس میں محبت اور نفاست کا عجیب امتزاج ملتا تھا۔ ایک

مصور یا نقاش کسی مثالی تصویر کے بنانے میں امید جو صناعانہ سلیقہ اور شغف کو بروئے کار لاتا ہے
سید صاحب وہی باتیں اپنے مہمان کے لئے روا رکھتے تھے۔ وہ دوسرے کاموں میں پورے
طور پر منہمک ہوتے تھے لیکن مہمان کو ایک لمحہ کے لئے نہیں بھولتے تھے۔ یہ بات اتنی
واضح ہوتی تھی کہ موٹی سے موٹی عقل والا مہمان بھی سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا تھا۔

ان کی صحبت میں ہر قماش کے لوگ موجود ہوتے جو ذہنی یا سماجی اعتبار سے
مختلف سطح پر ہوتے لیکن ان میں سے کسی کو یہ شکایت کبھی نہیں پیدا ہوئی کہ سید صاحب
نے کسی کے لئے کوئی کمی یا زیادتی روا رکھی۔ یہی وہ عجیب و غریب ملکہ یا خلوص تھا
جس نے سید صاحب کو ہر ایک کا محبوب بنا رکھا تھا۔ بدایوں کے دوران قیام ہی میں
ایک موقع پر میں نے عرض کر دیا کہ سید صاحب بننے کو تو میں آپ کا مہمان بن گیا
لیکن زمانہ پر آشوب ہے خدا نہ کرے میرا آپ کا سابقہ کسی اور طرح سے ہو۔ سید صاحب
کسی قدر متعجب ہو کر بولے کیوں کیوں خیر تو ہے۔ میں نے کہا آپ میری دیکھ بھال
اس طور پر کرتے ہیں جیسے آپ کو میری ساری کمزوریاں معلوم ہیں اور یہ بات دیار غیر
بالخصوص بدایوں میں میرے حق میں کچھ اچھی نہیں ہے۔ سید صاحب بہت محظوظ ہوئے
اور فرمایا اس بات پر آپ کو بدایوں کے اصلی پیڑے انعام میں دیئے جائیں گے
بات آئی گئی ہوئی۔ بدایوں سے ریل زیادہ رات گئے روانہ ہوتی تھی۔ رخصت
ہونے کا وقت قریب آیا تو معلوم ہوا سید صاحب غائب ہیں۔ تھوڑی ہی دیر
میں تشریف لائے۔ فرمانے لگے کمبخت دوکان بڑھا گیا ورنہ پیڑے ساتھ کر دیتا خیر یہ

پڑے سید پر قرض ہیں۔ میں بہت نادم و متاثر ہوا۔ عرض کیا سید صاحب آپ لیا کرینگے تو میں بدایوں میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔ فرمایا اور میں کب رہا۔ پھر گلے لگا لیا اور اس طور پر ملے جیسے زندگی میں شاید پھر نہ ملنا ہو۔ اور ہوا بھی ایسا ہی!

سید کی شخصیت کا یہ کمال تھا کہ کوئی کسی ذوق یا منش کا کیوں نہ ہو سید سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ میرے بعض احباب انگریزی تہذیب و معاشرت کے دلدادہ اور انگریزی حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے سبب سے زندگی و زمانہ کا مخصوص تصور رکھتے ہیں۔ ان کو مشرقی تصورات اور مشرقی آداب بود و ماند سے کوئی سروکار نہ تھا یہاں تک کہ مشرقیت کا مذاق اڑانا اپنی طرز زندگی کا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ اس قبیل کے ایک دوست بدایوں پہنچ گئے۔ ایک بار علی گڈھ آئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے سید صاحب سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح سنایا جیسے زندگی میں ان کو ایسا عجیب و غریب واقعہ کبھی پیش نہ آیا تھا کہنے لگے۔ بھائی یہ سید تو کہیں بند نہ تھا اس پر کسی کا رعب ہی نہ پڑتا تھا۔ میں نے ایسا شریر و شگفتہ بڈھا کہیں نہ دیکھا۔ جو بات جہاں کہہ دیتا اور جتنا برجستہ کہتا وہ کسی کے اٹھائے نہ اٹھتی تھی۔ میں نے ایسا باغی نہ دیکھا جس کی کہیں سے گرفت نہ ہو سکتی تھی۔ یہ بڈھا تو ذہین نوجوان اور حسین عورت سے زیادہ کشش اپنے اندر رکھتا ہے اسکے سامنے چپ بھی نہیں رہا جاتا تھا اور بیباک ہونے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سید صاحب کی وفات کے بعد دوست کو یہ خبر سنائی تو وہ دم بخود سے ہو گئے تھوڑی دیر بعد بولے بھئی میں ہوتا تو اس کی میت دیکھنے خود جاتا۔ مرنے پر بھی اس کی دلفریبی نہ گئی ہوگی!

مرحوم سیّد نصیر الدین علوی (علیگ)

سید نصیر الدین علوی مرحوم ہنستے کھیلتے زندہ رہے اور ہنستے ہی کھیلتے اُٹھ گئے۔ آغاز اور انجام دونوں قابلِ رشک۔ میں سمجھتا ہوں ایسے شخص کی عاقبت بھی سب سے نہیں تو بہتوں سے یقیناً بھلی ہوگی۔ میرا اُن کا اسکول میں بھی ساتھ رہا اور کالج میں بھی۔ وہ مجھ سے سینیر تھے۔ لیکن نصیر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں نصیر صاحب رہے۔ خواہ وہ اسکول میں رہے ہوں خواہ کالج میں خواہ سب ججی پر فائز۔

گورنمنٹ ہائی اسکول جونپور میں ہم دونوں پڑھتے تھے۔ میں بورڈنگ ہاوس میں رہتا تھا وہ اٹالہ کی مسجد کے پائیں اپنے آبائی مکان میں۔ لیکن دن کا زیادہ حصہ ایک دوسرے کیساتھ ہی گزرتا تھا۔ نصیر صاحب مٹھائی کے بڑے شائق تھے۔ مجھے بھی اِس چیز سے کچھ دشمنی نہ تھی۔ گھر پر جب مٹھائی اچھی خاصی مقدار میں جمع ہو جاتی تھی تو مرحوم بشارت دیتے کہ آجاؤ۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے) نصیر بھائی (مسلم بورڈنگ ہاوس جونپور میں بڑوں کو صاحب"

کے بجائے "بھائی" سے مخاطب کیا جاتا تھا اتنی مٹھائیاں کہاں سے آجاتی ہیں جواب دیا جنات لاتے ہیں۔ تین چار سال ہوئے مرحوم علی گڑھ تبدیل ہو کر آئے تو ایک دن شکایتاً فرمایا۔ رشید تم آتے نہیں۔ میں نے کہا۔ وہ جنات بھی آتے رہیں یا نہیں بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے بھئی پہلے جنات مٹھائی لاتے تھے اب سب کھا جاتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر مجھے کہاں بلاتے ہیں میں اپنے جنات بھی آپ ہی کے ہاں بھیج دیا کروں گا۔

مرحوم کی زبان میں لکنت تھی اور طبیعت میں بلا کی شوخی اور جولانی کبھی جوش میں آگر یا بے اختیار ہو کر گفتگو کرتے تو ان کا بات کرنے میں اٹکنا اور پھر یک بخت کھد بڑنا مزا دے جاتا تھا۔ اسکول میں ہیڈ ماسٹر اور ماسٹروں سے اور کالج میں یہاں کے منتظمین سے الجھتے رہتے ہیں ان کو خاص لطف آتا تھا شوخی شرارت، خوش طبعی اور وضعداری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اسکول میں ہاکی کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی ٹینس بھی لیکن انھیں کھیل سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنا کھلاڑیوں میں گھلے ملے رہنے کا شوق تھا۔ میں انھیں کے ساتھ الہ آباد کی مشہور نمائش دیکھنے گیا تھا تین چار دن الہ آباد میں رہے، پاؤں سے جوتا نہیں اُتارا پہنے پہنے سو جاتے، لوگوں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے، بولے بھئی بڑا مزا آتا ہے لحاف کے اندر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نمائش میں گھوم رہے ہیں!

عرصہ کی بات ہے جب سردیوں میں گوروں کی پلٹن دورہ پر نکلتی تھی۔

ہم لوگوں کو ان سے ہاکی فٹ بال کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ مرحوم ایک بار مصر ہوئے کہ انھیں بھی ٹیم میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ اسکول ٹیم کیسا تھ یہ بھی پولیس کے میدان میں ہاکی کھیلنے پہنچے۔ کہنے لگے دیکھو جی ہمارا جہاں سے جی چاہے گا کھیلیں گے اور جیسا جی چاہے گا کھیلیں گے۔ بیچ میں ٹوکنا مت بیں نے کھاروئی کی مرزئی تو اتار دیجیے بولے کہنے لگے سردی لگتی ہے جب ذرا طبیعت میں گرمی آئے گی تو اُتار دوں گا۔ مرحوم کی پشت کا بالائی حصّہ شانوں سے متصل نسبتاً زیادہ پر گوشت تھا جس کے سبب سے ان کی گردن پیچھے سے دیکھئے تو چھپی معلوم ہوتی تھی اس پر روئی کی یہ مرزئی ہاف بیک کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اسٹک کندھے پر رکھے ہوئے کھیل شروع ہوا۔ نصیر صاحب کے پاس گیند آئی تو یہ اُسے لیکر ایک خاص انداز سے بھاگے حاضرین نے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے سامنے سے ایک گورے نے آکر چاہا کہ گیند چھین نے نصیر صاحب نے گیند روک لی اور معاً گورے کے سر پر اسٹک تان کر کچھ اس قسم کی آمادگی ظاہر کی گویا اس کا سر بیچ سے دو لخت کردیں گے۔ گورا غریب کچھ ایسا بھو چکا ہوا کہ اضطراراً دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن حریف نے موقع کی نزاکت فوراً محسوس کی اور اس طور پر بڑھا کہ نصیر صاحب کی خیر نہیں۔ ادھر یہ بھی غافل نہ تھے فوراً بڑھ کر شیک ہینڈ (مصافحہ) کیا تمام مجمع اور خود گورے ہنستے ہنستے لوٹ گئے!

مرحوم کو پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اور نہ امتحان میں فیل پاس ہونے کو کچھ بہت اہمیت دیتے تھے۔ شوخی۔ شرارت اور اسی نوع کی معرکہ آرائیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ کالج میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ یا معرکہ تصنیف کرتے رہتے۔ لیکن اس طرح کے معرکے کبھی منتظمین کالج یا اساتذہ کے خلاف نہ ہوتے نہ اس کا تعلق سیاسی یا جماعتی مناقشوں سے ہوتا۔ ان باتوں سے وہ بالکل ہی بے تعلق تھے۔ ان کی ریشہ دوانیاں یا ہنگ و دو تمام ترا نہیں ہی تک محدود رہتی۔ مجھے یاد آتا ہے ایک بات پر آج کل جہاں طلبا قواعد پریڈ کرتے ہیں وہیں رات کے دو بجے دو جماعتوں میں جن میں کم وبیش سو آدمی تھے لاٹھی چلی خوب چوٹیں آئیں مرحوم نے مارا بھی اور چوٹ بھی کھائی میں نے نہ مارا نہ چوٹ کھائی بھاگے دونوں۔ دوسرے دن بحث اس پر ہوئی کہ پرنسپل کے ہاں فریاد لے جائیں اور حریف کو سزا دلوائیں۔ زصد صاحب نے کہا ہرگز نہیں۔ خوب پیٹا اور اچھی طرح پٹ لئے۔ پھر شکایت کیا اور سزا کیسی! چلو سب لوگ ہسپتال چلیں!

فریقین نے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا اور اسی صبح کو ہر کلاس میں مضروب پٹیاں باندھے لکچر سن رہے تھے۔ جو اس قابل نہ تھے وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ اتنا بڑا ہنگامہ آٹھ دس گھنٹے کے اندر آیا گیا ہوا۔

کالج میں مرحوم ہمیشہ کسی نہ کسی دھن میں رہتے۔ کبھی الکشن کے منصوبے

باندھ رہے ہیں۔ کبھی خطابات تصنیف کر رہے ہیں یا خاص خاص قسم کی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ کبھی کسی کمرہ میں پڑے گنگنا رہے ہیں اور کبھی برآمدہ میں کھڑے آنے جانے والوں کو گالی دے رہے ہیں اور سب کو ہنسا رہے ہیں۔ ان کے بغیر دوستوں کی محفل پھیکی رہتی تھی۔ وہ کبھی اپنے کمرہ پر نہیں پائے گئے۔ ہمیشہ کسی دوسرے کے ہاں ملے اور کبھی نہ کسی نئے مشغلہ میں مصروف دوست دشمن دونوں میں مقبول تھے۔ اس لئے کہ وہ منافق بالکل نہ تھے ہر شخص جانتا تھا کہ نصیر جتنی گالیاں دیتا ہے اتنا ہی سینہ سپر بھی رہتا ہے۔

کالج میں الکشن کا زمانہ تھا۔ مرحوم اُن لوگوں میں تھے جن کے ہاتھ میں الکشن کی باگ تھی۔ بن سمجھوتہ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسے مرحوم نہ ماننا چاہتے تھے اور نہ نامنظور کرنے کی ذمہ داری لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ دہلی چلے گئے۔ خورجہ کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی سامنے سے فریق ثانی کے وکیل آتے دکھائی دیئے جنھوں نے مرحوم کو دیکھکر جلد جلد قدم بڑھانے شروع کئے۔ نصیر صاحب بہت سٹ پٹائے کیونکہ ملاقات ہو جانے پر ان کا سارا نقشۂ جنگ درہم برہم ہو جاتا۔ اِدھر اُدھر دیکھا راہ فرار مسدود نظر آئی آخر ایک غریب کتے کا سہارا پکڑا۔ یہ بے چارہ قریب ہی چپکے چپکے انتہائی ادب کے ساتھ وہی بڑے کے گرے پڑے بیتے چاٹنے پر آمادہ ہو رہا تھا۔ اس کی شکل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مہینوں اُسے دہی بڑے کے بیتے سونگھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی

تھی۔ مرحوم نے اسے بڑی زور سے ڈانٹا اور اس کی طرف اس طور سے لپکے کہ اُسے مار ہی ڈالیں گے۔ کتا غریب بھاگا اور یہ اس کے پیچھے ڈھیلا پھینکتے شور مچاتے بھاگے۔ اس کا خیال البتہ رکھا کہ بے خیالی میں کہیں کتے سے آگے نہ نکل جائیں۔ جب تک گاڑی سیٹی دے کر متحرک نہیں ہوگئی یہ برابر اس کا تعاقب کرتے رہے۔ یہاں تک کہ گاڑی چل نکلی اور یہ لپک کر پاس والے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ ذاکر صاحب، میں اور نصیر صاحب قانون کے طالب علم تھے، قیام صاحب باغ کی دوسری منزل پر تھا چھت پر صرف ایک غسل خانہ اور ایک ہی بیت الخلا۔ وہ بھی انگریزی وضع کا۔ آبادی کافی تھی مختلف ڈیل ڈول اور مختلف عادات و اطوار کے، پشاور، آسام مدراس سندھ، یوپی، اور پنجاب کے خاص الخاص نمائندے جمع ہو گئے تھے۔ غسل خانہ اور بیت الخلا سے متعلق نت نئے پیچیدہ اور دلچسپ مسائل پیدا ہوتے رہتے ذاکر صاحب اسسٹنٹ ٹیوٹر تھے لیکن انھوں نے اس طرح کے مسائل کا تصفیہ نصیر صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں سلجھائیں کسی کو انحراف کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ ہر شخص نے اس سے اتفاق کیا۔ نصیر صاحب حسب معمول بڑے شوق اور تن دہی سے اس فریضہ کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے ہر شخص کے بیانات سُنے خوب بحثیں کیں۔ یوں

تو شاخ در شاخ بہت ساری باتیں پیدا ہوئیں جن کا تذکرہ نہ مناسب ہے نہ ممکن صرف دو ایک کے بیان کر دینے میں مضائقہ نہیں ؛

ایک صاحب کسی ریاست کے باشندے تھے۔ بکی تول سے تقریباً تین من کے اسی حساب سے غذا اور اسی حساب سے نتائج ناشدنی و ناگفتنی۔ ایک اور صاحب سرحد سے بھی پرے کے رہنے والے تھے سو کھے منحنی "خشک چھوہارے" کے نام سے مشہور تھے اول الذکر کے بارہ میں پبلک کو یہ شکایت تھی کہ بیت الخلاء میں اپنا وقت تو بہت کم صرف کرتے تھے لیکن خود بیت الخلا کو دوسروں کے لائق نہ چھوڑتے تھے۔ دوسرے صاحب کے بارے میں یہ شکایت تھی کہ یہ وقت بہت زیادہ لیتے تھے لیکن پلے کچھ نہ پڑتی تھی۔ نصیر صاحب نے فیصلہ کیا کہ ریاست والے صاحب سے درخواست کیجائے کہ وہ حملہ کسی کھیت میں کیا کریں۔ اس کے بعد بیت الخلاء پر خشک چھوہارے کو سمجھایا کہ ان کے لئے دین و دنیا دونوں میں طہارت معاف ہے وہ اپنی چارپائی پر ہی فراغت کر سکتے ہیں۔ نوکر بستر جھاڑ دیا کرے گا۔ ضمناً نصیر صاحب نے یہ ہدایت نافذ کر دی کہ جو لوگ بیت الخلا میں زیادہ وقت صرف کرنے کے عادی ہیں وہ ابتدائی امراض سسٹنٹ ٹیوٹر صاحب کی نگرانی میں اُن کے کمرہ کے سامنے طے کر لیا کریں اور جب ان کو اپنے آپ پر پورا اعتماد ہو جائے تو بیت الخلا میں داخل ہوں۔

غسل خانہ کے بارے میں نصیر صاحب نے یہ ہدایت کی کہ جس پر شرعی غسل واجب ہو اس کو تفریحی غسل کرنے والے پر ترجیح دیجائے گی بشرطیکہ اول الذکر نصیر صاحب

کو حالات و حوادث سے مطلع و مطمئن کر کے ان سے پاس حاصل کرلے۔ غسل خانہ میں گنگنانا یا شعر پڑھنا اخلاقی نقطۂ نظر سے مذموم و ممنوع قرار دیا گیا۔ نصیر صاحب نے اس کی وضاحت بھی کردی تھی لیکن یہاں ان کو دہرایا نہیں جا سکتا۔

صاحب باغ کا باورچی خانہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ ایک دن رات کے کھانے پر ایک صاحب کی پلیٹ میں چھپکلی کا ہڈی کا پورا ڈھانچہ آیا۔ ممکن ہے بے نصیب چھپکلی ٹھیک دیگچی کے اوپر چھت میں چپکی ہو اور گرمی اور دھوئیں سے بدحواس ہو کر دیگچی میں ٹپک پڑی ہو۔ صاحب باغ میں کہرام مچا۔ نصیر صاحب بھی پہنچے ڈھانچہ دیکھکر دھک سے رہ گئے اور چہرہ سے ایسی تشویش کا اظہار کیا کہ سارے لوگ تھوڑی دیر کیلئے دم بخود ہو گئے۔ پھر نہایت مایوسانہ انداز سے ایک ایک کا منہ تکنے لگے۔ لوگ متحیر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بالآخر نہایت رقت کے لہجہ میں فرمایا بھائیو جو ہوا سو ہوا۔ صبر تو بہر حال کرنا ہے لیکن گھروالوں پر کیا گزری ہوگی، مرحوم کو میں جب کبھی دیکھتا تھا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ دن دور نہیں جب یا تو وہ خودکشی کریں گے یا میں۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے پہلے چل بسیں گے لوگ متحیر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر پوچھا گیا کہ یہ سب کیا اور کس کے بارے میں ہے تو مرحوم نے فرمایا آپ سب تو ہیں شقی اور مردہ دل دیکھئے نہیں یہ ڈھانچہ خشک چھوہارے کا ہے نصیر صاحب کے اس لطیفہ پر لوگوں نے زبردست قہقہہ لگایا اور لطف یہ کہ خشک چھوہارے نے اس کی سب سے بڑھ کر داد دی۔ اور یہ محض اس وجہ سے کہ سب

جانتے تھے کہ نصیر بڑا ہی جان نثار اور مخلص دوست تھا، پھر لطیفہ کی داد دینا خواہ کوئی زد میں آتا ہو ایم اے او کالج والوں کی سیرت کا خصوصی امتیاز تھا جو آج کل بہت کم نظر آتا ہے۔

نصیر صاحب سب جج ہو کر علی گڑھ آگئے، اپنی کوٹھی پر بنیائن پائجامہ پہنے بیٹھے رہتے۔ ہر طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے اور سب سے دل کھول کر ہنستے بولتے۔ ان کی بے تکلفی ان کے خلوص کا آئینہ تھی۔ وہ اس اعتبار سے عجیب و غریب آدمی تھے کہ اُن پر فریقین معاملہ کو کلی اعتماد ہوتا وہ عدالت میں فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے مکان پر فریقین میں مصالحت کرا دینے کی کوشش کرتے۔ ایک بار میں نے نصیر صاحب سے کہا کہ آپ جو مقدمات کا تصفیہ گھر پر کرانے کے درپے رہتے ہیں اس کا نتیجہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ کہنے لگے ہاں ہاں ایسا حاکم قانونی استعداد کے اعتبار سے نیازمند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ جنگ کی ہلاکتیں دیکھے اٹھائے ہوتے ہیں اُن سے پوچھو جنگ کسے کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کی جنگ خواہ وہ قانونی ہو تجارتی ہو یا فوجی بڑی تباہ کن ہوتی ہے۔ مقدمہ بازی نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا تم کو اندازہ نہیں ہے۔ اس کو میں سمجھتا ہوں اور میں ہی جانتا ہوں۔ عدالت میں قانونی انصاف ہوتا ہے حقیقی انصاف تو بچ کے شریفانہ سمجھوتہ ہی میں ہوتا ہے۔

ایک دن میں نے دیکھا اپنی کوٹھی پر آرام کرسی پر دراز ہیں بنیائن اور پاجامہ

زیب تن ہے۔ ہر طرح کے لوگ جمع ہیں حقے اور پان کا دور چل رہا ہے اور
نصیر صاحب کے فقروں سے محفل کشت زعفران ہے اور بنیائن الٹی پہنے ہوئے ہیں
میں نے کہا یہ کیا تو بولے ارے میاں تم تو جانتے ہو بنیائن کا بڑا عیب یہ ہے کہ
اُتارو تو الٹی اترتی ہے اُتاریئے سیدھا کیجیے اور رکھیے۔ کون اس درد سر میں
مبتلا ہو۔ جوں کا توں پہن لینے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ ایک دفعہ الٹی رہتی
ہے دوسری بار سیدھی خود بخود الٹ پھیر ہوتا رہتا ہے ؎

نصیر مرحوم کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ اُن کو غیر موزوں اور مہمل اشعار بھی سالہا
سال جوں کے توں یاد رہتے۔ اسے میں بڑا کمال سمجھتا ہوں کیوں کہ میں خود ان
لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک
انھیں ناموزوں نہ بنا لیا جائے۔ منشی ٹھاکر پرشاد شاداں ایک بڑے "زوردار"
شاعر تھے۔ ایسے ایسے معرکے کے اشعار تصنیف کئے تھے کہ ہمارے زمانہ میں ان
کے کلام سے کالج کے درو دیوار گونجتے تھے۔ مرحوم ہی نے ان کو ہم سے روشناس
کر لیا تھا۔ شاداں اس زمانہ میں اتنے مقبول ہوئے کہ ان کو خط لکھا گیا کہ کلام
کے کچھ نسخے بقیمت بھیج دیئے جائیں۔ کچھ دنوں بعد شاداں کے صاحبزادہ
کا خط آیا، کلام شاداں کے کئی نسخے بھی تھے۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

... ... قبلہ گاہی صاحب مغفور کے کلام کی
اہلِ ہندوؤں نے کوئی قدر نہ کی۔ صرف اہل اسلاموں نے کی ... ...

کالج میں مدتوں اہل ہندوؤں اور اہل اسلاموں کا فقرہ مقبول رہا
نصیر مرحوم ان کا کلام بڑے مزے لے لیکر سناتے تھے۔ شاداں کا کلام یوں بھی
سر تا سر مرصع تھا۔ اس پر مرحوم کی زبان میں لکنت اور آواز میں کھٹک۔
سناتے تو مزا آجاتا۔ شاداں کی ایک غزل تھی جس کا عنوان غالباً یہ تھا۔

"غزل یگانہ بصنعت اعراب سہ گانہ"

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

جبھیں آیا یہاں پر وہ دل شکن نہ کہا کسی کو یہ اس نے کُن
تبھیں فارسی میں یہ بولے کُن جبھیں باجے چھن تیرے گھونگرو

نہیں دیکھتا ہوں کبھی سُپن نہ سنا ہے گولی کی کچھ بھی پن
نہ کیا ہے دیکھئے کچھ پُن جبھیں باجے چھن تیرے گھونگرو

کریں ہیں جو مکھیاں یوں ہی بھُن کریں مچھڑ یہی دے بھی بھن
گیا شاداں کا بھی دل بھُن جبھیں باجے چھن تیرے گھونگرو

شاداں کی ایک غزل کے چند اور اشعار سنئے

مضمون قدِ یار کا ہے رَستہ اٹھار باندھ
بوسے کے واسطے نہ ضرورت ہے پہاڑ باندھ

گر ہے ہوس ہما کو کسی طرح پھانسئے
ترکیب یہ ہے دام میں اسکے تو ہاڑ باندھ

فرہاد سے جو ملنے کی خواہش ہو تو وہ پہ
تیشے کوے کے جائیو اور ایک کلھاڑ باندھ

ایک جگہ مضائقہ لا لقہ و قائقہ کے سلسلہ میں خود بندھ گئے ہیں۔

لالہ ہوں لکھنؤ کا رکھوں لکھنؤ کا داغ
پھولوں جو غیر جا پہ کہاوں شقائقہ

مرحوم بڑی محبت کے آدمی تھے اور اپنی وضع کے بڑے پابند دوستوں کی بڑی مدد کرتے تھے کنبے والوں کا سہارا تھے۔ ان کی وفات کتنے بے خاندان وکس مپرس ہو گئے۔ میں نے ایسا کنبہ پرور اور دوستوں پر جان چھڑکنے والا بہت کم دیکھا ہے۔ نکمّے معذور۔ ہٹے کٹے غرض ہر طرح کے کنبے والے ان کے ساتھ رہتے جو نہیں رہتے تھے انھیں روپئے بھیجتے رہتے۔ سب کو ایک نظر سے اور عزت و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سب کو ایک طرح کا کھلاتے پہناتے تھے۔ سب کو سب سے ملاتے تھے بغیر اس خیال کے کہ لوگ کیا کہیں گے اور کیا نہ کہیں گے۔ وہ غریب کمزور اور بدحال عزیزوں کو اپنانے میں کسرِ شان نہیں سمجھتے تھے۔ سمجھئے تو یہ بہت بڑی بات ہے اور سمجھ میں نہ آئے تو ذرا خود اس طرح رہنے کا ارادہ کیجئے پھر دیکھئے کتنا جلد آپ کا نفس آپ سے کیا سلوک کرتا ہے اور آپ اپنے عزیزوں سے کیا سلوک کرتے ہیں ؎

مرحوم شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ جہاں گئے وہاں شعر و شاعری کی محفل گرم ہو گئی۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مرحوم کو جتنی ہزلیات یاد تھیں اور ہزلیات کی انھیں جیسی مشق تھی اتنی بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہو گی ہر طرح کی اور ہر درجہ کی ہزلیات۔ ہزلیات کے حق میں کلمۂ خیر

کہنا ممکن ہے بعض بزرگوں کے نزدیک بھلمنساہٹ سے گری ہوئی بات ہو۔ کچھ شاید میری دانشمندی میں بھی شک کریں لیکن اس فن میں درجۂ کمال حاصل کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اردو فارسی میں ہزلیات کے نام سے جو کلام ملتا ہے اُسے فحاشی یا مغلظات کہنا زیادہ موزوں ہے جس طرح طنز یا ظرافت میں ذرا پاؤں ڈگمگائے تو نتیجہ کمینگی یا مسخراپن (یا ان دونوں کا مجموعہ سفلہ پن) ہوتا ہے۔ اسی طرح ہزل میں نری بدکرداری یا بیہودہ گفتاری کا دخل ہو تو وہ صرف مغلظات بن کر رہ جاتی ہے۔ اچھے شعر کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ پڑھے جانے پر وہ سامعین کی تمام تر توجہ اس طور پر جذب کرلے کہ اگر اس میں کوئی نقص بھی ہو تو اس کی طرف فی الفور ذہن منتقل نہ ہو۔ اسی طرح سب سے اچھی ہزل وہ ہے جس کے پڑھے جانے پر سامعین کا ذہن اس کے رکیک یا سخیف پہلو میں اُلجھ کر نہ رہ جائے بلکہ شاعر کی سلیقہ اور طبّاعی کی داد دینے پر مجبور ہو جائے۔ ظاہر ہے ہزّالی ہزّالی ہی ہے لیکن اُس شاعر کے کمال کو آپ کیا کہیں گے جو گندگی سے کھیلتا ہے لیکن طہارت زائل نہیں کرتا نہ اپنی ـــــ اور نہ غالباً آپ کی!

مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کو اُن کے دوست نہ جلد بھولیں گے اور نہ بھولنا گوارا کریں گے ـــــ اور یہ بڑی بات ہے!

یلدرم کی یاد میں

اپنے رفقاء اور طلبا سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر "بحثنے" کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیشِ نظر ہیں ان کی دل افروز شاعری اور انشاپردازی تمام تر ان کی دل آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشاپرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری اور انشاپردازی میں خامی بھی اسی حد تک ملتی ہے جس حد تک بحیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا یا اُس سے علیحدہ ہو!

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اس زمانہ کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی نہ اب جب زندگی

سواخوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ع:

بزم کو برہم ہوئے مدّت نہ گزری تھی بہت

جب سے اب تک زمانہ کے رویّہ اور روانی میں بہت کچھ فرق آگیا ہے کیسا کچھ فرق۔ جن قدروں پر "جب مرنے والے لاکھوں تھے" اب ان پر رونے والا کوئی نہیں۔ لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی اُن میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت وشخصیت کا بہت اہم اور مہتم بالشان پہلو ہے۔

اُنھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں۔ ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیر وزبر کرسکتی تھیں۔ لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد و اُمید آفرینی تھی کہ ان کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر سے پاؤں تک شریف شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے اُنھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نواب سر مزمل اللہ خاں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ اُنھوں

نے کام سب کے ساتھ کیا سازش کسی سے نہ کی میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم
کی شرافتِ نفسی اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری وہ یونیورسٹی میں بھی رہے
اور کالا پانی میں بھی لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو
گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور
میں نہ گرمی آئی ہے نہ روشنی اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بھر کی
سرگرمیوں سے سروکار ہوسکتا ہے الا شعر و ادب سے۔ اس یونیورسٹی میں شعر و ادب کے
دیوانے میں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں ایک
مولینا احسن مارہروی دوسرے سجاد حیدر یلدرم۔ ترکی۔ ترک اور ترکی ادب
سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وارفتگی طاری ہوتی
تھی میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب
کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں
میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی
ادب ہی جاندار ہے یا اس میں آپ کی شائبہ خوبی تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک
دفعہ جھوم ہی تو گئے۔ آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی اور چہرہ جگمگا اٹھا۔ کہنے لگے
جناب (سید صاحب جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس
پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے ہماری

آپ کی نہیں ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے آپ کی تو کہیں نہیں ہے مسکرائے اور بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور ان ہی کی ہو سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آرائوں کی زبان ہے۔ اس میں ترک تازی ہے سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے۔ نامق کمال کا مشہور ڈراما جلال الدین خوارزم شاہ میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جس کا بیشتر حصہ سہیل میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہیں۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے ہیں لیکن جہاں تک اردو الفاظ فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے میں سید صاحب کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے اچھوتے بڑے جان دار اور بڑے گوارا اردو الفاظ استعمال کرتے تھے الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی اختراع کا ترجمہ میں بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے۔ یہاں مجھے مولوی عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن سا باکمال ترجمہ کرنے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کو سمجھنے کی استعداد عنایت اللہ مرحوم

میں خرقِ عادات کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بات اُن ہی کے حصہ میں آچکی تھی۔ وہ اُردو کے گہوارہ میں نہیں پلے تھے بلکہ اُردو ان کے گہوارہ میں پلی تھی۔ وہ اہل زبان ہی نہ تھے متمدن بھی تھے!

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کئے ہیں اُردو مضامین نسبتاً کم ہیں۔ ترکی انشاپردازی کا انداز بیان ہی کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اُردو لکھنے میں ان کا قلم ترکی تال وسم قبول کر لیتا تھا۔ سید صاحب کے اس رنگ و آہنگ پر بعض لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئی ہیں بالذات خود میں اُردو میں انداز ترکانہ کو بڑا اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

سید کے اسالیب انشاء اور ان کی موضوعات سید کی شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُردو میں انشاء لطیف کی ابتدا نثر ریاض اور یلدرم کی تحریروں سے ہوئی۔ انشاء لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک سب رس کا انداز متعزلانہ تصوف کا ہے جو انشاء لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشاء لطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کر لیا اور ٹیگوریت نے اُردو میں سستے اور ادنےٰ درجہ کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقات ادب کو سختی سے احتساب کرنا پڑا اور یہ انداز جلد ہی نظروں سے گر گیا یہاں تک کہ جو صاحب اس کے سب سے بڑے حامی تھے وہ سب سے پہلے تائب ہوئے اُردو میں ٹیگوریت کی جس طرح ابتدا ہوئی اور جیسا اس کا انجام ہوا مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے شعر و ادب کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے جسکے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

شرر اور ریاض کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشائے لطیف میں فرق ہے۔ شرر کا اسلوب نثار اور اُن کا عشق دونوں کتابی، بندھے ٹکے، ڈھلے ڈھلائے شخصی تاثرات کی ترجمانی نہیں شاعرانہ زبان و بیان کی نمائش ملتی ہے ریاض میں زبان و بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پُر تصنع لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ اُن کی نثر میں پہنچکر سستی اور عامیانہ بنگئی ہے شاعری میں جو انداز بیان شاعری کا حُسن ہے وہ نثر میں پہنچکر مصنوعی اور مہمل ہو جاتا ہے موضوع اور سطح کے یکساں ہونیکے باوجود نثر اور نظم کی مقتضیات میں فرق ہے ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے ہاں بھی حسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجازی طرفگی تازگی ہے شرر اور ریاض کی پیداوار یکسر مثنیٰ ہے۔ سجاد کی دوستی، سجاد انصاری کو بھی انشائے لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے جس کو انشائے لطیف سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ انشائے لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے بقولے ؎

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے

لیکن جس طرح غزلوں میں آرٹ اور اقدار کے اختلافات ملتے ہیں ادب لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادب لطیف کے بعض دوسرے علم بردار وں میں یہ فرق واضح ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی بھی ہے شرارت بھی

لیکن شہدپن نام کو نہیں۔ یلدرم کے ہاں عورت کا بڑا عمل دخل ہے لیکن ان کے ہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ اعصاب کا تشنج نہیں مہدی افادی کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہیں ہے تو کچھ پیدل بھی نہیں ہے۔ افادی کہیں کہیں تو شوق کی مثنویوں سے جا ملی ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے مراتب صنفی کا اتنا ہی فرق ہے جتنا تفاوت زمانی کی بنا پر ہونا چاہیئے اگر ان دونوں کو ایک دوسرے کے عہد میں منتقل کر دیا ہوتا تو مہدی شوق بن جاتے اور شوق مہدی۔

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رو او روانی میں بھی اپنے وزن اور وقار کو بہہ نہیں جانے دیتے سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے جس کے ہاں خیالات کی رعنائی ہو اس کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آ گئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبش قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پر معتدل کیا ہے کہ اظہار مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغدار نہ ہوا۔

میرے نزدیک انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت و عفت کو جس طرح یلدرم نے متوازن رکھا ہے کسی اور نے

نہیں رکھا ہے۔ سجاد حیدر کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی
ہے۔ قاضی عبدالغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں لیکن دونوں
کی ذہنی پرداخت میں تفاوت ہے۔ غفار کی تحریر میں طنز کی تیزی و تلخی بھی
شامل رہتی ہے اِس طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبدالغفار سجاد حیدر کی بجائے سجاد
انصاری سے زیادہ قریب ہیں۔ مجھے اکثر یہ محسوس کر کے خوشی اور اطمینان ہوا ہے
کہ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین چوٹی کے
انشا پرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر، سجاد انصاری اور قاضی
عبدالغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ وہ اُس
زمانہ میں بھی جوان تھے جب جسم و جان کے اعتبار سے نحیف و نزار ہو چکے تھے
تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل
کی اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے۔ اُردو
ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی
شاعری کے بڑے مداح تھے اور اُن کی ایک مخصوص نظم بڑے مزے لے لیکر پڑھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک فارسی مجلہ "——" نامی برلن سے ٹائپ میں شائع
ہوتا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ
مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے سر مجھ بہت

سارے لفافے کاغذات کے کچھ منتشر اجزا ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں اُن سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آرہا تھا اس کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اُس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی۔ ہموار کسی قدر تیز چھوٹے چھوٹے قدم لیتے تھے۔ نگاہ نیچی تقریباً عمودی۔ دس بارہ قدم چل کر اک ذرا کی ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے سے ایک اُچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر اُن کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو وہ بھی چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی اس کی تعریف نہ کروگے! اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آرہا سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی میں نے اُٹھا لیا۔ کچھ ہی دور اور بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا وہ بھی میں نے اٹھا لیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لفافہ نے مفارقت کی وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالہ کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ سید صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہنچا۔ آفس پہنچکر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے معلوم ہوا تین لفافے گم ہیں۔ چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک متفکر رہے میں نے

تینوں لفافے کچھ وقفہ سے واپس کئے۔ سید صاحب فرمانے لگے آپ بھی کمال کرتے ہیں فوراً کیوں نہ دے دیئے اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی میں نے کہا آپ مطالعہ میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا ۔

میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمائیے "ایرانشہر" ہے ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جاندار مضامین و نظمیں ہیں ایرانی وطن پرستوں نے برلن سے اسے شائع کیا ہے کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ "بت سنگی" (لیتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت سا رو درہیگی میں نے کہا۔ سید صاحب بت سنگی کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے۔ بت آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقول شخصے۔ ع

حرف پڑھ سکا پڑا ہے ٹائپ کا

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں پھس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ ہی پلید کر دی میں نے عرض کیا سید صاحب۔ اکبر نے کہیں پھس نہیں ملائی حرف پھس میں چنگاری لگائی ہے۔ ہنسے پھر فرمایا اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں!

سید صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ بلاد رم کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے۔ ان کی سب سے پہلی نظم مرزا پھویا بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت

زیادہ نہیں ہیں لیکن گزشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دل کش پہلو لطف سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ سید صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے ان کا مزاج رومانی تھا۔ وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے پستی کی طرف ہرگز نہیں موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کردی گئی ہے اس کو مزاج و خیال کی رنگینی کی بجائے مطالبات جنسی قرار دیا گیا ہے وہ بھی اس طور پر کہ جو چیز صحت کی دلیل تھی وہ مستقل (اور لا علاج) مرض قرار پائی۔

سجاد صاحب کی ایک نظم جو اُن کی رنگینیٔ رسائی طبع سیرت کی پاکیزگی اور اُن کے نقطۂ نظر کی دل آویزی کی ترجمان ہے "شملہ کالکا لائن پر ایک نظارہ" کے عنوان سے سب سے پہلے تہذیب میں شائع ہوئی۔

سید صاحب کی یاد کے ساتھ یہ نظم ہمیشہ وابستہ رہے گی ؎

ماتھے پہ بندی۔ آنکھ میں جادو۔ ہونٹوں کی بجلی۔ گرتی تھی ہرسو
چال بچکتی۔ بات لہکتی۔ جیسے کسی نے۔ پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی۔ جن میں بھے رقصاں۔ لمحہ میں رادھا۔ لمحہ میں راہو
ایسی بھڑک تھی۔ خلق تھی حیراں۔ ریل پہ آیا۔ کہاں سے آہو

سجاد صاحب کو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا ان میں سے کسی کا نام آجاتا تو سید صاحب وجد میں آجاتے

جس زمانہ میں وہ مسلم یونیورسٹی کے رہبر ارہتے ایک بار اُن کو ترکی جانے کا موقع مل گیا!
میں کیا بتاؤں اُن پر کیا انشاط طاری تھا صحت اچھی نہ تھی میں نے کہا سید صاحب
سفر طویل ہے تکلیف وہ بھی کیسی گزرے گی؟ فرمایا ترکی کے خیال میں طبیعت مگن
ہے یہ شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا۔ یا یہ خاک وہاں کی خاک میں
مل جائیگی یا پھر دیکھیے گا کیسا رقصاں شاداں واپس آتا ہوں۔ چند ماہ بعد واپس آئے
سید صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں
اسپرنگ لگے ہوئے ہیں جسم میں توانائی۔ چہرہ پر بشاشت اور سرخی آگئی تھی۔ میں
نے پوچھا ترکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی
نظر آئی لیکن مجھے تو ترکی سے اُلفت ہے اس کے بدلنے نہ بدلنے سے کیا سروکار
ترکی ادیبہ خالدہ خانم اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے۔
موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا او
ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاء پردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔
خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوب انشاء سے تائب ہوگئی ہیں اور
اُسے صرف ایام جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہوگئے۔ بعد میں ایک
صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم اُن کی ایام
جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے۔ پھر خلطِ مبحث سے کیا حاصل سوال
یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں!

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے ان کو توڑ
جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں
پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب
کی طرح وہ اہل مناصب سے بھی مرعوب نہ ہوئے۔ لیکن فن کے کمال کی
داد دینے میں بڑے سخی تھے سید کو میں نے شاید ہی کبھی "تم" کے لفظ سے
کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت
کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں
آپے سے باہر نہ پایا۔ اور ہنسی دل لگی میں ان کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ
نہ سنے جو مذاقِ سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے رچے ہوئے آدمی بہت
کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت
کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے
جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا
ہے بغیر کسی ارادے یا تکلیف کے یلدرم میں رسمی تکلیف بالکل نہ تھا۔ انکی
بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک
تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا اور
بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت
کا جزوِ اعظم سمجھی جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچے سے

اونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر و ادب کا ان کو ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ وہ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے جو بات اُن کے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ اُن کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ حامل یا قدرداں تھے وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں ہوں۔ یلدرم سے واقف اور اُن کی خوبیوں کے معترف تھے۔

سید سجاد حیدر اُن لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن ہو۔

وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے اُن سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فردوس میں اُن کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں ٭

سر شاہ محمد سلیمان

بہت دنوں کی بات ہے جب چھوٹے چھوٹے شہروں یا بستیوں میں معمولی واقعہ پر غیر معمولی دھوم دھام یا ہلچل مچ جاتی تھی۔ چونتیس پینتیس سال گزرے ایک صبح جونپور کے چھوٹے سے شہر میں غیر معمولی ہمہمی کے آثار پیدا ہو گئے میں اسکول کے ابتدائی درجوں میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں جو شہر کے عین وسط میں رہتا تھا۔ اسامنے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا جنگلا بورڈنگ ہاؤس اور شاہراہ کے درمیان حدِ فاصل تھا تھوڑی دیر میں ایک جلوس گزرنے لگا۔ بورڈنگ کے سارے لڑکے جنگلے پر آگئے۔ جالی کے پیچھے سے کسی منظر کے دیکھنے کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے جس کو چھوٹے بچے اور اچھے شاعر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

پھولوں سے لدی اور سجی ہوئی دو گھوڑوں کی ایک پر تکلف گاڑی گزر رہی تھی جس میں دو ایک بزرگوں عزیزوں کے ساتھ ایک

معمولی جسامت لیکن نہایت درجہ نمایاں ذکاوت کا ایک خوشرو لڑکا بیٹھا ہوا تھا جس کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ کبھی جھک کر دائیں بائیں دیکھتا کبھی ہار پھولوں سے اُلجھ جاتا۔ کبھی پاس والوں سے جلد جلد باتیں کرنے لگتا۔ کبھی گاڑی کے تکیہ سے پیٹھ لگا لیتا۔ لیکن فوراً ہی آگے جھک کر کچھ دیکھنے لگتا۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُکتا کر جلوس کو چیرتا پھاڑتا کودتا پھاندتا سب سے آگے نکل جائیگا۔ دو رویہ لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر چھوٹا بڑا جوان بوڑھا یہ سمجھتا تھا کہ یہ خوشی اسی کے گھر اُتری ہے۔ اور خوشی منانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانیکی کوشش کرتا تھا۔ یہ جونپور کے مشہور گھرانے اور سب سے مشہور وکیل حافظ محمد عثمان صاحب کے بڑے لڑکے شاہ محمد سلیمان تھے۔

نئی دلی سے نظام الدین اولیاء کی طرف ایک خاموش جلوس جا رہا تھا ہر طرح کے لوگ ملول و محزوں کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے نظام الدین اولیا پہنچا۔ ایک تازہ قبر نظر آئی۔ آس پاس کی زمین روندی ہوئی تھی جس پر پانی چھڑکا گیا تھا۔ قبر پر ہار پھول کا انبار تھا۔ یہاں الہ آباد ہائی کورٹ اور فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ریاضیات کے مشہور ماہر اُردو شعر و ادب کے شیدائی اور ماہر مانے ہوئے شریف النفس انسان سر شاہ محمد سلیمان نظام الدین اولیا کی سنسان پراسرار بستی میں بقدر ایک سکوت اضافہ کر کے آسودۂ خاک تھے۔

قانون میں جو اونچا درجہ سرشاہ کو حاصل تھا اس سے ہم میں شاید
ہی کوئی ناواقف ہو اور شاید ہی کوئی ایسا ہو جو قانون سے مجھ سے
زیادہ ناواقف ہو اس لئے میں ان کی قانونی فتوحات پر کوئی تبصرہ نہ
کروں گا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ جو لوگ قانون سے ناجائز فائدہ
اٹھانا چاہتے۔ خواہ وہ کوئی ہوں اور کیسے ہی ہوں سرشاہ سے کبھی
مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کے بعض ایسے قانونی معرکوں کا مجھے علم
ہے جہاں سرشاہ کی قانونی نکتہ سنجی ہی کا نہیں بلکہ اس سے بدرجہا سخت
آزمائشوں کا امتحان رہا لیکن سرشاہ نے قانونی مطالبات سے سرمو انحراف
نہ کیا شخصی اعتبار سے سرشاہ نرم خو واقع ہوئے تھے۔ ہر شخص کی سن لیتے تھے۔
ہر شخص کو راضی رکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے عواقب بھی بھگتتے تھے لیکن جب
قانون کا پاؤں درمیان ہو تو پھر وہ سب کچھ بھول جاتے تھے اور وہی کرتے
تھے جو قانون کا مطالبہ ہوتا۔

شروع سے آخر تک وہ قانون میں ایسے رچے بسے رہے کہ قانون ان کی
فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ اس بارے میں ان کی مثال ایسے شخص سے دی جا سکتی
ہے جس کے شعور میں یہ حقیقت پیوست ہو گئی ہو کہ خدا حاضر و ناظر ہے۔ اسلئے
اس کو خلوت و جلوت میں کہیں بھی خدا کے بتائے ہوئے راستہ سے انحراف
نہ کرنا چاہیے۔ خدا کا نہیں قانون کا یہ تسلط عملی زندگی میں بعض عجیب الجھنیں

پیدا کر دیتا ہے۔ سر شاہ قانون سے خوب نبٹتے تھے۔ شیطانوں سے بالکل نہیں نبٹ سکتے تھے ؂

سر شاہ کو طبیعیاتی ریاضی سے بڑا شغف تھا اور اس فن میں ان کا درجہ مانا ہوا تھا۔ مجھے ریاضی سے طبعاً نفرت ہے۔ سر شاہ اپنی تحقیقات کے نتائج مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ طبعیات کے عام جلسے میں اکثر پیش کرتے ہیں محض یہ دیکھنے کے لئے کہ سر شاہ طبیعیات کے دقیق مسائل پر کیسی بحث کرتے ہیں۔ تماشائی کی حیثیت سے ضرور جاتا۔ اللہ اکبر سر شاہ کس اعتماد و ذکاوت سے اس پر لکچر دیتے اور بحث کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے تمام عمر اس شخص نے اسی فن کا کام کیا ہے۔ فن کے خواص بھی کافی تعداد میں موجود ہوتے لیکن ایک روایتی امپیر کی حیثیت سے (اور مجھ ایسے لوگوں کی ایسے مجمع میں کمی نہیں ہوتی) میری رائے یہی ہوتی کہ سر سلیمان ہی کا پلہ اونچا رہا۔ ایک چیز مجھے یاد ہے کہ ایک مشہور پروفیسر نے بہت کچھ رد و قدح کے بعد کہا کہ اچھا یہ تو بتائیے آپ کا یہ نظریہ کس فارمولا کے تحت میں آتا ہے اور آپ کیونکر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں سر شاہ کا جواب یہ تھا کہ میں آپ کے سامنے نتائج پیش کرتا ہوں جو واقعات سے ثابت ہیں۔ آپ واقعات و نتائج کی تاویل کیونکر کریں گے۔ فارمولا تو بعد کو بنے گا۔ اور میں نہ بنا سکوں تو آپ بنائیے۔

سر شاہ نے اپنی بڑی صاحبزادی کی شادی کی۔ مرحوم کی سرگرمی و سرخوشی

کا یہ عالم دیکھنے کا تھا۔ تقریب سے متعلق ساری جزئیات منقح کر کے دم لیتے تھے۔ ہر کام میں خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا ہو خواہ بڑے سے بڑا۔ ان کا ہاتھ ضرور ہوتا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے مہمانوں کی تعداد معین کی، اتنے ہی دعوت نامے جاری کئے۔ پھر خود بیٹھ بیٹھ کر یہ اندازہ لگایا کہ فی کس کتنی جگہ گھرے گی۔ فیتہ لیکر ہر چیز کو ناپ ڈالا۔ اس طرح پنڈال کا رقبہ متعین کیا۔ پھر برف کا حساب لگایا کہ کتنی مقدار درکار ہوگی۔ پہلے برف کی ایک معینہ مقدار منگائی اور ضروری حفاظتی تدابیر اختیار کرنے بعد گھڑی لیکر یہ دیکھا کہ کتنی دیر میں کتنی برف پگھل جائے گی۔ اس کے بعد یہ طے کیا کہ برف کی مجموعی مقدار کیا ہو۔

اس شادی کے سلسلہ میں سر شاہ کے باضابطہ ہونے کا ایک واقعہ بھولوں گا مرحوم کسی ضروری سفر پر الٰہ آباد سے باہر جا رہے تھے۔ اسٹیشن پہنچے تو دیکھا کہ مزدوروں کا ہجوم ہے اور ایک تعلیم یافتہ نوجوان مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت سے سر شاہ کے منتظر ہیں نوجوان نے سرمایہ اور مزدور کے مسئلہ پر ایک دھواں دھار تقریر کی اور سر شاہ پر یہ الزام لگایا کہ لڑکی کی شادی میں انھوں نے مزدوروں کی مزدوری نہیں دی اور یہ آئین مروت اور آئین انسانیت دونوں کے خلاف تھا۔

سر شاہ نے یہ تقریر بڑی توجہ اور سنجیدگی سے سنی۔ اس دوران میں پلیٹ فارم پر اور زیادہ مجمع ہو گیا۔ مرحوم نے اپنے کلرک کو موٹر پر کوٹھی بھیجا اور بتایا کہ فلاں الماری میں فلاں فائل فلاں نمبر پر رکھی ہوئی ہے۔ فوراً جا کر لاؤ اور جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے

مزدوروں سے پوچھتے رہے کہ تمہاری یومیہ مزدوری کیا ہے اور اسی قسم کی باتیں
کرتے رہے۔ کلارک نے تھوڑی دیر میں فائل لاکر دیدی۔ مرحوم نے فائل کھول کر پوچھنا شروع
کردیا کہ کس کس شخص نے کس کس دن شادی میں کام کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی نے کام نہیں
کیا تھا۔ اور سارے کے سارے مزدور ادھر اُدھر سے اکٹھا کرلئے گئے تھے۔ سر شاہ نے نوجوان
اور مزدور دونوں کو اپنی فائل دکھائی جس میں ہر مزدور کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ ہر ایک کے
نام کے آگے مزدوری اور بیباقی لکھی ہوئی تھی اور دستخط ورنہ انگوٹھے کا نشان بنا ہوا
تھا اس کے بعد سر شاہ نہایت خوش دلی کیسا تھ جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہ تھا سب سے
رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ نوجوان نے البتہ پھر کبھی شاہ کا سامنا نہ کیا۔

سر شاہ کے ایک پیشکار تھے جو مرحوم کے روپئے پیسوں کا بھی حساب رکھتے تھے
ایک دفعہ کچھ ایسا ہوا کہ پیشکار صاحب نے بیس روپئے غلطی سے کہیں زائد دیدیئے
سر شاہ نے وہ روپئے ان سے وصول کرلئے اور بولے یہ اس لئے کہ آپ سے پھر کبھی
ایسی چوک نہ ہوگی۔ اتفاقاً ایک بار خود سر شاہ دو سو روپیئے پیشکار صاحب کو غلطی
سے دے گئے۔ حساب ہوا تو غلطی دریافت ہوئی پیشکار صاحب نے بہتیرا چاہا کہ وہ
دو سو روپئے جو اُن کے پاس محفوظ تھے واپس کردیں۔ سر شاہ نہ مانے اور یہ
فرمایا یہ دو سو روپئے تمہارے ہیں یہ اس لئے کہ آئندہ مجھ سے غلطی نہ ہو۔

جس زمانہ میں سر شاہ الہ آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے ایک صاحب کی
معیت میں مجھے مرحوم کی کوٹھی پر رات بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ رات کا کھانا

سر شاہ کا باہر تھا۔ ہم سب کھا پی کر سو چکے تھے سر شاہ بارہ بجے رات کے بعد واپس آئے میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا کچھ آہٹ ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سر شاہ پورے ڈنر سوٹ میں ملبوس ایک سینی میں کھانا لئے ہوئے شاگرد پیشہ کے کوارٹرس کی طرف جا رہے ہیں۔ صبح سویرے مجھے اس کی تلاش ہوئی کہ یہ معاملہ کیا تھا معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ جو نوکر تھا اس کو کھانا نہ ملا تھا۔ سر شاہ نے ڈنر سے واپس آنے پر دریافت کیا کہ مہمانوں کی مدارات میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ مہمانوں کا نوکر چونکہ شہر چلا گیا تھا اس لئے اس کو کھانا نہ مل سکا۔ چنانچہ بغیر کسی تامل کے سر شاہ نے یہ فریضہ پورا کیا گھر میں کسی نے کہا نوکروں میں سے کسی کو جگا کر کھانا بھجوا دیا جائے تو نہ مانے اور کہا کہ نوکر دن بھر کے تھکے سو رہے ہیں یہ کام مجھ ہی کو کرنا چاہیئے میں مہمان ہی کا میزبان نہیں ہوں اُن کے نوکروں کا بھی میزبان ہوں۔

سر شاہ کو شاعری سے دلچسپی تھی شاعروں کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ مشاعرے میں بڑے شوق سے شرکت کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ عام گفتگو میں لطف سخن کی خاطر بھی جوش اور مبالغہ کو دخل نہ دیتے تھے مشاعرے میں اوسط درجہ کے شعر کی بھی دل کھول کر داد دیتے تھے مجھے تعجب ہوتا ہے کہ سر شاہ جیسی طبیعت اور مصروفیتوں کا آدمی اس طرح کی باتوں میں کس طرح وقت گزارنا پسند کرتا تھا۔ مشاعروں میں ان کی شرکت رسمی نہ ہوتی اگر وہ مشاعرہ کے صدر بنا دیئے جاتے تو پھر جب تک صحبت ختم نہ ہو جاتی کوئی نہ کوئی عذر کر کے اٹھ جانا درکنار وہ شروع سے آخر تک دلچسپی لینے میں معمولی

سے معمولی آدمی سے بھی پیچھے نہ رہتے۔ جہاں تک اردو شاعری اور مشاعرہ
کا تعلق ہے الہ آباد میں سرشاہ اور سرتیج سے زیادہ ان چیزوں کا اور
کوئی قدر داں نہ تھا۔ سرشاہ کو ذوق کے کلام سے بڑی الفت تھی۔ ان
کے قصائد کو مدوّن کیا اور اس پر تبصرہ بھی کیا ہے اور ایک اچھے جج کی مانند
کلام کو اُسی حد تک سراہا ہے جس حد تک وہ کلام سراہے جانے کا مستحق ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ایک دور بڑا سخت گزرا جب اس پر ایک تحقیقاتی
کمیشن بٹھایا گیا تھا کمیشن نے یونیورسٹی کی آئندہ درولبست کے لئے جو سفارشات
تجویز کی تھیں ان کو ایک مکمل ضابطہ کی شکل دے کر نافذ کرنا بڑا نازک اور مشکل کام
تھا اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو قانونی نکتوں سے واقف ہو۔ علی گڑھ کی دیرینہ
روایات کا قدر داں ہو اور علی گڑھ کی ناموری اور نیکنامی کا دل سے جویا ہو۔ سرشاہ
نے اس کے لئے عارضی طور پر مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا منظور کیا۔ جن لوگوں
نے وہ زمانہ دیکھا ہے وہی جانتے ہیں کہ سرشاہ نے کس قابلیت اور جانفشانی
اور دلسوزی کے ساتھ اس مرحلہ کو طے کیا شکستہ خاطروں کی دلجوئی کی۔ کام کرنے
والوں میں کام کرنے کا نئے سرے سے ولولہ پیدا کیا اور ان کے وزن وقار کو
دوبارہ زندگی بخشی :۔

سرشاہ ایسے قابل بے لوث اور اَن تھک کام کرنے والے ہم میں خال خال
ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا کام خصوصیت کے ساتھ نہایت پیچیدہ پایاں اور

مختلف النوع ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی بات نہیں۔ سرشاہ ہمیشہ ہر
ہفتہ اتوار کو یا جب کبھی فیڈرل کورٹ میں چھٹی ہوتی یا ان کو موقع مل جاتا
علی گڑھ چلے آتے۔ اور آنے کے ساتھ ہی یہاں کے کاموں میں منہمک ہو جاتے
آفس میں قیام کرتے۔ ڈائننگ ہال سے خرید کر کھانا منگاتے اور آفس ہی میں سوتے
وہ یونیورسٹی کا ایک پیسہ اپنی ذات پر نہ صرف کرتے بلکہ اس بارے میں وہ اس درجہ
محتاط تھے کہ بعض پرانے زمانہ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دن رات
طلبا، سٹاف بیرونی عمائد اور اکابر سے سابقہ رہتا۔ اُن کی سنتے اپنی کہتے
اور کام نپٹاتے۔ انھوں نے کسی حال میں ملاقات کرنے سے گریز نہ کیا۔

سرشاہ میں کام کرتے رہنے کی کیسی بے پایاں طاقت تھی کیسا ہی مشقت کا
کام کر کے اُٹھے ہوں میں نے ان کو ہمیشہ ایسا پایا گویا اچھی طرح آرام کرنے کے بعد پورے
ولولہ اور طاقت کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں میں نے کبھی ان کو جمائی یا انگڑائی
لیتے نہ پایا بات سمجھنے میں کسی نے کبھی یہ محسوس نہ کیا کہ سرشاہ پر کسی قسم کا اضمحلال طاری
ہے سرشاہ نے کبھی طنز، غصہ یا آزردگی سے گفتگو نہیں کی حالانکہ ایسے مواقع
اکثر آئے جب بحث میں دوسری طرف سے معمولی درجہ کے لوگوں نے ایسی باتیں
روا رکھیں یا ایسا انداز اختیار کیا جن کو معمولی درجہ کا آدمی بھی بڑی مشکل سے
انگیز کر سکتا تھا جس طرح ایک تندرست چھوٹے بچے کو چند وقفے کے لئے بھی
پورے طور پر ہاتھ پاؤں چلانے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ ٹھیک اسی طور پر

شاہ سے یہ ناممکن تھا کہ وہ تھوڑی دیر تک بھی اپنے ہاتھ پاؤں آنکھ شانہ گردن وغیرہ کو معطل رکھ سکیں۔

سر شاہ اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے اور بہر دولت سے بہرہ مند ہونے کے باوجود بیحد متواضع تھے۔ ہر شخص سے ہر وقت ملنے کیلئے تیار رہتے۔ پان سگریٹ سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن یہ چیزیں ہر ملنے والے کو پیش کی جاتیں۔ گرمی میں شربت اور سردی میں چائے سے ضرور تواضع کرتے۔ وہ مشکل کشائی پر آمادہ رہتے۔ دفع الوقتی سے کبھی کام نہ لیتے۔ وہ بڑے آدمی تھے لیکن بڑے آدمیوں کے وطیرہ کیخلاف اپنے اثر واقتدار سے اپنے آپ کو نفع یا دوسروں کو نقصان پہنچانیکے بجائے ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے تھے اور جھوٹے وعدوں سے دوسروں کو لٹکا رکھنے کی اُن میں بالکل عادت نہ تھی۔

سر شاہ کے بارہ میں ان کا دشمن بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کبھی کسی سازش میں شریک ہو سکتے تھے وہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتے تھے اسلامی روایات اور مشرقی ادب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیقہ سے رہتے تھے۔ کپڑے صاف اور اجلے پہنتے تھے پچاس سے متجاوز ہونے کے باوجود جسمانی صحت خوش دلی چابکدستی اور بشرہ سے وہ کہیں کم عمر نظر آتے تھے میں نے سر شاہ کے سے خوبصورت سفید بال کسی اور کے نہ دیکھے وہ بہت جلد ہنس پڑتے ہیں جس میں خلوص اور بے تکلفی ہوتی۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کو دیا بہت کچھ اور لیا کچھ بھی نہیں کاش موت نے ان کو اتنی مہلت اور دی ہوتی کہ وہ قومی زندگی میں براہ راست ہماری مدد [illegible] تے۔

حسن عبداللہ

بھونپو بے وقت بجا۔ دل دھک سے ہو گیا۔ حسن عبداللہ رحلت کر گئے۔ صرف چند لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ دفعتاً بیمار ہو گئے تھے۔ ورنہ یونیورسٹی کے احاطہ میں کسی شخص کے ذہن میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ حسن عبداللہ کی وفات کا اعلان کیا گیا تھا۔ یا کوئی مرسکتا تھا سوا حسن عبداللہ کے وہ ایسے کڑیل جوان تھے۔ جہاں ہوتے دور سے پتہ لگ جاتا کہ حسن عبداللہ مصروف کار پیکار ہیں!

یونیورسٹی کے حال ہی میں "اسٹیوارڈ" مقرر ہوئے تھے۔ اس کام کے علاوہ یونیورسٹی میں رسد رسانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اپنے اور دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور مشاغل اپنا رکھے تھے۔ یونیورسٹی میں کوئی تقریب ہونیوالی ہو دوسروں کے ہاں کوئی انتظام درپیش ہو شہر میں کوئی جلسہ ہونیوالا ہو علی گڑھ سے باہر کوئی ہلچل ہو۔ باہمہ ہو حسن عبداللہ کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی حیثیت سے پیش پیش رہتے۔ گفتگو سے، بحث مباحثے سے، ہاتھ پاؤں سے، شعر و شاعری سے

دل سے، دام سے، دواودش سے، زندگی میں کس بلا کی تب وتاب تھی!
لمبے تڑنگے، خوش رو، خوش لباس اکڑنے اور فروتنی دونوں میں یگانہ
نہ آہستہ بولتے تھے، نہ چپکے سے کام کرتے، ان کی زندگی کے ساز میں دھیما سُر
کوئی نتھا ہی نہیں بڑے شریف گھرانے کے تنہا اُجالا تھے، اخلاق و وضع داری
میں کھرے مشرقی جس کو محبوب رکھتے اُس کو کوئی نا ملائم کہے تو حسن عبداللہ کا
رنگ متغیر ہو جاتا پھر نہ وہ اپنا دیکھتے نہ پرایا، نہ چھوٹا نہ بڑا، نہ نیچ نہ اونچ،
نہ اپنے بس میں ہوتے نہ دوسرے کے، سنبھل جاتے تو قدموں پر سر رکھ دیتے!
میرے وہ شاگرد تھے۔ اُنھوں نے مسلم یونیورسٹی ہی سے اُردو میں ام۔ اے
کیا تھا۔ پی۔ ایچ ڈی کی فکر میں لندن گئے۔ لڑائی چھڑ گئی تو سلسلہ منقطع کر کے
ہندوستان واپس آگئے۔ گریجویٹ ہوتے ہی وکالت شروع کر دی تھی لیکن
ان کا دل اُردو لکھنے پڑھنے میں لگتا تھا۔ کچھ دنوں آگرہ میں اُردو فارسی کے لکچرار
رہے۔ یہ سب ہوا اور ہوتا رہا لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کا معلم بننے کا
حوصلہ اور ولولہ دل سے نہ نکلا کاش کسی نے ان کی وہ والہانہ تمنا دیکھی ہوتی
جب وہ اپنے خاص انداز سپردگی میں کہتے تھے رشید صاحب مجھے کچھ نہ چاہیئے
مجھے تو آپ شعبہ میں لے لیجئے، میں تنخواہ نہ لوں گا بلکہ کچھ اپنے پاس سے دونگا
مجھے میرے اللہ اور میرے آبا نے کھانے بھر کو دے رکھا ہے۔
میں نے ان کو شعبہ میں لینے کی تحریک بھی کی، لیکن ہوا وہی جس کا اندیشہ

تھا یونیورسٹی نے ان کو نہ چھوڑا لڑائی کے زمانہ میں رسد رسانی کا جو کام
ان کے سپرد کیا گیا تھا وہ اس کو اس انہماک اور سر جھکا دینے والی ایمانداری
سے کرتے تھے کہ یونیورسٹی کے حکام کے اِس مقولے کا رد کرنا بھی آسان نہ تھا
کہ ارد و لکھرار تو آج نہیں کل کوئی نہ کوئی مل جائے گا حسن عبداللہ جیسا
ایماندار میر سامان نہ ملے گا' یہ بات سچی اور پکی تھی ہم میں سے بڑے سے
بڑے بے ایمان کا مقولہ تھا کہ حسن عبداللہ جیسا ایماندار کوئی اور نہ تھا!

حسن عبداللہ جذباتی تھے۔ جتنا جلد چڑھ جاتے اُتنا ہی جلد من جاتے
وہ ہمیشہ چڑھتے پہلے تھے منتے بعد میں تھے' اور جب من جاتے تھے تو پھر
آپ کے لئے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ مولوی نذیر احمد نے (EXPLOSIVE)
کا ترجمہ بھک سے اڑ جانے والا مادّہ لکھا ہے۔ اس سے بڑھ کر شاید خود
انگریزی کا لفظ بھی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا حسن عبداللہ کے بارے میں
بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھک سے اُڑ جانے والے شخص تھے۔ اس
جلالی صفت کے بعد ان کی جمالی صفت آتی۔ جب وہ منانے کے لئے پاؤں پکڑ
لیتے معذرت کے سارے کلمات استعمال کر جاتے اور کام کر دیتے!

میرے سامنے وہ سگریٹ نہ پیتے۔ میں دفعتاً ان کے آفس میں پہنچ جاتا
اور وہ سگرٹ پیتے ہوتے تو اسے مسل کر چھپا دیتے یا پھینک دیتے اور سر قد
کھڑے ہو جاتے۔ میں نے ان سے بارہا کہا کہ ہم تکلفات میں کچھ دھرا نہ تھا۔ اس

سے مجھے آپ ہی سے نہیں، خود اپنے سے بیگانگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ بات میرے لئے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کو یہی اچھا لگتا ہے۔

میں نے ان کو دلجمعی سے آفس میں بیٹھے کبھی نہ پایا۔ کوئی موجود ہے تو اس سے بھرے ہوئے ہیں۔ کوئی نہ ہو تو ٹیلیفون ہی پر کسی سے آداب تسلیمات یا مار دھاڑ میں مصروف ہیں ٹیلیفون پر بھی بڑے زور اور دھما کے سے گفتگو کرتے ایک دفعہ ان کے آفس پہنچا اور بولا حسن صاحب ذرا لائبریری کو ٹیلیفون کرنا ہے۔ کہنے لگے ٹیلیفون خراب ہے۔ میں نے کہا جبھی تو آپ کے ہاں آیا ہوں اٹنشن ہو گئے۔ اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ وہ نہ صرف ہر نامعلوم حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے بلکہ کہیں اور سے حملہ نہ ہوا تو خود حملہ کر بیٹھیں گے بولے یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا میرا مطلب یہ ہے کہ آپکی آواز بگڑے ہوئے ٹیلیفون پر بھی منزل مقصود تک پہنچ جائے گی اس لئے آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں ...... فوراً جیسے کمر کھول دی، اور ہنس پڑے کہنے لگے قبلہ آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ انشاء اللہ!

امور شرعیہ میں بڑے بے جھجک اور بے لچک تھے۔ انگلستان میں ٹیوب کے اسٹیشن پر اترے سامنے زینہ تھا زینہ کے موڑ پر تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی آنے جانے والوں کا ریلا تھا۔ حسن صاحب کو نماز کا وقت آگیا۔ وہیں نیت

باندھ کر کھڑے ہو گئے ادھر کا مجمع ادھر اور ادھر کا ادھر گڑبڑ مچ گئی۔ پولیس سارجنٹ بلایا گیا۔ اُس نے پہلے تو کچھ غور کیا، پھر کچھ کہا یہ رکوع میں چلے گئے وہ دو قدم پیچھے کھسک گیا۔ اس کے بعد سجدے میں چلے گئے تو اس نے سیٹی بجائی یہ اٹھ کھڑے ہوئے تو اس نے اُن کے دونوں شانوں کو جھنجوڑا یہ نیت توڑ کر اس سے گتھ گئے معاملہ پولیس کمشنر تک پہنچا، اُس نے ان کو سمجھائی کی کہ شارع عام راستہ چلنے کے لئے ہے عبادت کے لئے نہیں اور سارجنٹ کو تاکید کی کہ غیر ملکیوں کا بہر حال احترام کرنا چاہیئے۔

یہ واقعہ آج کل کہیں ہندوستان میں ہو جاتا تو اللہ ہی جانتا ہے کیا کچھ نہ ہو جاتا!

شعر کہنے پر بلا کی قدرت تھی غالب کے دیوانے تھے۔ کیا مجال کوئی غالب کو بُرا یا بھلا کہہ کر ان کے سامنے یا ان کی گلی سے نکل جائے۔ تقریر کرنے میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے اس کے پیچھے تو جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آگرہ کسی کام سے گئے تھے وہیں سے مرض الموت لائے۔ شدت کا بخار چڑھا ساتھ ہی دست آنے لگے، لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کر ڈالا تھا دوستوں نے بہترا سمجھایا کہ موقع تقریر کرنے کا نہ تھا آرام کرنے کا تھا، بالآخر طے پایا کہ صرف معذرت کر کے چلے آئیں گے۔ معذرت کرنے کھڑے ہوئے تو ۲ ½ گھنٹے دھواں دھار تقریر کر ڈالی نڈھال ہو گئے بالآخر علی گڑھ لائے گئے حالت بگڑ چکی تھی لیکن دوڑ دھوپ علاج

معالجے سے طبیعت سنبھل گئی اور لوگوں کو ایک گونہ اطمینان ہو چلا تھا کہ مرض پر قابو پا لیا گیا ہے لیکن وقت پورا ہو چکا تھا دفعتاً طبیعت نے پلٹا کھایا اور اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے۔

یونیورسٹی میں غلے کی فراہمی اور رسد رسانی کا پہلے پہل انتظام مرحوم کے سپرد ہوا تو کیا دیکھتا ہوں ایک دن اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس چلے آرہے ہیں میں دیکھکر مسکرایا تو چوکنے ہو گئے۔ پوچھنے لگے بات کیا ہے قبلہ آپ کا مسکرانا خالی از علت نہیں، میں نے کہا کوئی بات نہیں، دل خوش ہو گیا۔ اس زمانے میں کسی کو اچھے لباس میں دیکھکر یوں بھی دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ آپنے اپنے لئے کپڑے کا انتظام کروالا تو میرے لئے غلہ کی بھی یقیناً فکر رکھیں گے تنک گئے اور بولے حضور والا یہ سوٹ میں نے انگلستان میں سلوایا تھا میں اسے عمداً پہن کر آیا ہوں اور اپنے دوسرے کپڑے بھی جلد جلد پہن کر دکھادوں گا تاکہ لوگ کبھی اور دیکھیں تو یہ نہ خیال کریں کہ میں نے یونیورسٹی کا روپیہ کھا کر یہ سب بنوایا ہے اور قبلہ (اب حسن صاحب تیز ہونے لگے تھے) میں نے فلاں صاحب کو اپنا بنک کا حساب بھی دکھا دیا ہے کہ اتنی رقم میری اپنی ہے تاکہ آگے چل کر چہ میگوئیاں نہ شروع ہو جائیں میں سنجیدہ بن گیا اور حسن عبداللہ صاحب کو ان کی عاقبت بینی پر مبارکباد دی ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ حسن صاحب اللہ آپ کی مدد فرمائے لیکن آپکے قیمتی کپڑوں اور بنک میں بچت کی میزان کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کپڑے منگنی کے ہوں۔ رہی بچت

سو یہ بھی تو ناممکن نہیں ہے کہ آپ نے کسی سے قرض لے کر دکھا دی ہو حسن صاحب برس پڑے کہنے لگے قبلہ اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کیجئے۔ کچھ اور کہنے والے تھے کہ میں ہنس پڑا اور وہ سمجھ گئے اور خود بھی ہنسنے لگے بولے قبلہ آپ کی انہی باتوں سے تو میں آپ کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا' ماشاء اللہ جزاک اللہ۔ میں نے کہا اچھا کرتے ہیں میرے سامنے سگریٹ نہیں پیتے لیکن احتیاطاً عقیدت میں کبھی کبھی عقل کا کھوٹ بھی ملاتے رہئیے' ورنہ کچھ اور پینے لگے گا!

پچھلے رمضان میں وائس چانسلر صاحب کے ہاں کچھ لوگ افطار پر مدعو تھے افطار سے پہلے بعض اہم کاموں سے متعلق مشورہ بھی تھا حسن عبداللہ بھی مدعو تھے لیکن ابھی پہنچے نہ تھے میٹنگ ہو رہی تھی۔ اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے حسن صاحب کی ایک فروگزاشت یاد کرکے برہمی کا اظہار کیا۔ اور بار بار کیا بات کوئی ایسی نہ تھی' لیکن جو چیز عجیب سی نظر آئی وہ یہ ڈاکٹر صاحب اس معاملہ کو رہ رہ کر یاد کرتے اور برہم ہوتے' حالانکہ حسن عبداللہ کو موصوف بہت عزیز رکھتے تھے اور مرحوم بھی ڈاکٹر صاحب کے فدائیوں میں تھے میرا دل بے اختیار چاہا کہ کاش اس وقت حسن عبداللہ آجاتے عجیب اتفاق کہ حسن صاحب آموجود ہوئے سارا کام چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب نے مواخذہ کرنا شروع کر دیا۔ پہلے تو حسن صاحب اسے معمولی بات سمجھتے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں سنبھل بیٹھے حاضرین میں سنبھل بیٹھے' حاضرین میں قاضی خورشید احمد صاحب ایم ایس سی علیگ

ریاضی کے مشہور ماہر بھی تھے جو حال ہی میں یو پی کے محکمہ تعلیم سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں مقیم تھے۔ قاضی صاحب کی زبان میں تھوڑی سی لکنت بھی ہے جو قاضی صاحب کے بحثنے میں اکثر بڑا لطف پیدا کر دیتی ہے۔ جو لوگ قاضی صاحب کی ذہانت و فطانت سے واقف ہیں وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے مواقع پر قاضی صاحب کی موجودگی کیا رنگ لا سکتی تھی۔

حسن عبداللہ صاحب نے جواب دہی شروع کی، ہر شخص خاموش تھا صرف قاضی صاحب کبھی کبھی سر ہلا دیا کرتے تھے۔ مباحثہ میں گرمی آ چلی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی طلبی دفعتاً ٹیلیفون پر ہوئی اب مطلع صاف تھا حسن عبداللہ نے قاضی صاحب کی طرف رخ کیا اور گرج کر بولے اور تو اور آپ کو دیکھئے کس مزے سے گردن ہلاتے تھے۔ قاضی صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ لکنت مانع آئی میں نے کہا حسن صاحب آپ سمجھے نہیں، قاضی صاحب تو آپ کی حمایت میں گردن ہلاتے تھے۔ قاضی صاحب نے سٹپٹا کر تنکے کا سہارا لیا، اور بولے اور نہیں تو کیا!

حسن عبداللہ اب جو گرجے ہیں تو زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا! قاضی صاحب کسی محفل اور مجمع میں بند ہونے والے لوگوں میں نہ تھے لیکن اس موقع پر ایسے بیچ ہوئے کہ سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ حسن صاحب نے اسی جوش و جلال میں سائیکل اٹھائی اور چل دیئے، ہم سب نے بہتیرا پکارا کہ افطار کرتے جایئے لیکن کون سنتا ہے!

کئی دن بعد ملاقات ہوئی تو ہنسنے لگے بولے قبلہ آپ نے خواہ مخواہ مجھے قاضی صاحب سے بھڑا دیا آپ کا تو کچھ نہ بگڑا روزے کی جھلاہٹ کی مجھے قاضی صاحب سے معافی مانگنی پڑی۔

مرحوم بڑے دوست پرست تھے۔ ان کے بہت سے احباب چھوٹی چھوٹی جگہوں پر تھے لیکن وہ ان کی خاطر اور اُن کی حمایت میں بڑے سے بڑے آدمی سے برد آزما ہونے کے لئے فوراً سر بکف ہو جاتے وہ جس کو اچھا یا اپنا محسن سمجھتے تھے اس کے خلاف کبھی کچھ نہ کرتے بلکہ اکثر بے محل اور بے جا پاسداری پر اُتر آتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ ادنیٰ کارروائی پر آمادہ کئے جا سکتے تھے۔ یا ان کی سیرت میں کوئی بنیادی خامی تھی وہ جذباتی آدمی تھے جذباتی آدمی بالعموم مخلص ہوتا ہے اس کے دل میں کھوٹ کپٹ کا بڑی مشکل سے گزر ہوتا ہے۔ طبعاً وہ عوام کے آدمی تھے اور چھوٹوں کی حمایت میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے تھے مجھے ان کی یہ ادا بہت بھاتی تھی!

میرا وہ بہت خیال کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں شگفتگی اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا اور جس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی یہ حالت ہوتی ہے اس کے مرنے کا مجھے بڑا غم ہوتا ہے لیکن اس غم کا مقابلہ اس غم سے کیسے کروں اور کون کر سکتا ہے جو مرحوم کے بوڑھے باپ بوڑھی ماں بھائی پر فدا ہونے والی

بہنوں، نیک نفس بیوی اور معصوم بچوں کو ہو گا۔ ایسوں کا غم اور ایسا غم اس رحمتِ بیکراں کی طرف سے مغفرت کی بشارت ہے جس کے جوار میں مرحوم پہنچ گئے ہیں کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہوں ؎

ملنے کا پتہ

انڈین بک ہاؤس مچھلی کمان

حیدر آباد دکن

مطبوعہ

اسلامی پریس بازار نور الامرا حیدرآباد دکن